زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
مدیر اعلیٰ : سیّد ضمیر جعفری
سمے کا بندھن کیوں پسند ہے ؟
نوباڈی
پچھمی ندی
پیرِ جواں
مفتی بڑا اپدیشک ہے
اکیسویں صدی کا استقبال کیسے کریں ؟
رومان اور چٹان کی علامت
ڈرامہ پی ٹی وی کی پہلی
ذمہ داری نہیں !
بحرِ اوقیانوس کے اُس پار
ممتاز مفتی
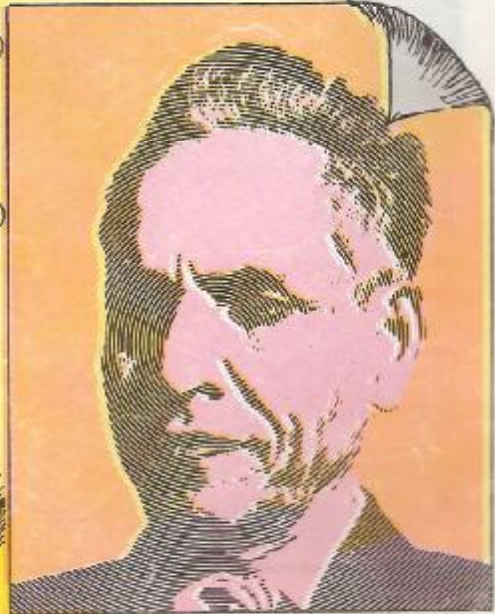
زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

اشاعت اول ----- اگست 1992ء

قیمت

فی شمارہ	18 روپے
چھ شمارے	104 روپے
زر سالانہ	200 روپے

بیرون ملک
(ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ :- ۴۵۶۹-۳ گوالمنڈی راولپنڈی۔ ۴۶۰۰۰ فون۔ ۵۴۰۵۷۹

ترتیب

اداریہ

آغاز سفر

"چہار سو" کا پہلا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ کچھ کہنا نہیں الا یہ کہ ------ ادب و زندگی کے لئے کچھ "سوغات" پیش کرنے کو ہمارا بھی جی چاہا۔ ادعا کوئی نہیں--------- کوتاہیاں بہت ہیں----------- بھروسا فقط رب سائیں کی ذات پر اور اسی کی بخشی ہوئی توفیقات پر-------

مالک دا کم بوٹا لانا لاوے یا نہ لاوے"!

O

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد نیویارک

نعت

عشق نبیؐ حیات کا سامان ہو تو خوب
دل ماسوا کے پیار سے انجان ہو تو خوب

چھیڑا ہے گیت نطق نے حب رسولؐ کا
ہر شعر کا اگر یہی عنوان ہو تو خوب

عنوان ہیں یوں تو اور بھی میرے کلام میں
نعت نبیؐ سے ہی مری پہچان ہو تو خوب

مشکل ہوا ہے حرف سخن نعت کے سوا
مشکل نہ یہ میری کبھی آسان ہو تو خوب

مجھ جیسے کج خصال کو ذوق عمل کہاں
انؐ کی نگاہ لطف کا فیضان ہو تو خوب

انؐ کے کرم سے انؐ کی حضوری نصیب ہو
یوں بھی خدا کی ذات کا احسان ہو توخوب

ہے عبد کو نصیب شفاعت رسولؐ کی
میدان حشر گر یہی اعلان ہو تو خوب

○

ممتاز مفتی مسعود قریشی اور محمد عمر کے ہمراہ
۱۹۵۱ء

ڈاکٹر جمیل جالبی اور افتخار عارف
ایک تقریب میں

ممتاز مفتی ضمیر جعفری اور غلام ربانی آگرو
کے ساتھ ایک تقریب میں

امریکہ کے شہر نیویارک کے ایک
مشاعرے کی جھلک

ثاقبہ رحیم الدین صاحبہ حکیم محمد سعید سے
وثیقہ اعتراف وصول کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ پنجاب مشاعرے کی صدارت
کرتے ہوئے۔
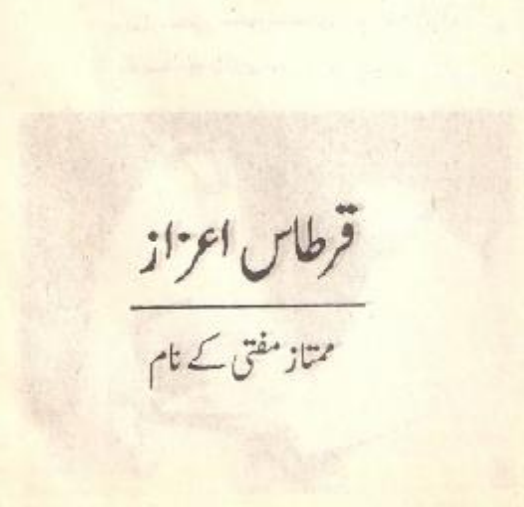
قرطاس اعزاز

ممتاز مفتی کے نام

نام: مفتی ممتاز حسین

قلمی نام: ممتاز مفتی

پیدائش: 11 ستمبر 1905ء بمقام بٹالہ (ضلع گورداسپور) پنجاب

تعلیم بی۔ اے۔ اسلامیہ کالج لاہور 1929ء

ایس۔ اے۔ وی سنٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج لاہور

1931ء تا 1932ء

ڈپلوما شارٹ ہینڈ، ٹائپ لاہور 1929ء

مختصر حالات زندگی: مفتی محمد حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں پائی۔ میٹرک 1921ء میں ڈیرہ غازی خان سے اور ایف۔ اے 1927ء میں امرتسر سے کیا اسلامیہ کالج لاہور سے 1929ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد سنٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب کے سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر خانیوال، دھرم سالہ، گوجرہ، چک جھمرہ، جام پور، ساہیوال، باغبان پورہ، قصور، شیخوپورہ سانگلہ ہل اور گورداسپور کے اسکولوں میں 1933ء تا 1945ء پڑھاتے رہے۔ لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں فیاض محمود اور مجید ملک کے ساتھ دوستی [illegible] ملاقات میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی پہلا مضمون گوجرہ ڈی بی ہائی سکول [illegible] ہوئے۔ 1945ء میں بطور اسٹاف آرٹسٹ اسکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو لاہور کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ جہاں اوائل 1947ء تک رہے۔ اس زمانے میں "ادب لطیف" لاہور مرتب کیا۔ 1947ء میں اداکار کمار اور بیگم کمار، اداکارہ [illegible] سے منسلک ہوگئے چوہدری برکت علی مالک مکتبہ اردو لاہور کے ساتھ معاہدہ ہوا کہ بمبئی سے فلمی رسالہ فلمان نکالیں گے۔ اس معاہدے میں احمد بشیر بھی شامل [illegible]

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

"رضیہ سلطانہ" کی کہانی لکھی۔ اسکرین پلے اعظم مرزا نے تیار کیا تھا۔ یہ فلمی پرچہ اور رضیہ سلطانہ فلم فسادات کی نذر ہو گئے اور ممتاز مفتی 1948ء تا 1949ء میں بطور سب ایڈیٹر ہفت وار "استقلال" لاہور میں کام کیا۔ 1949ء میں پی۔ آر۔ ی پاکستان ایئر فورس میں سائیکالوجسٹ ہوگئے لیکن یہ محکمہ 1950ء میں ٹوٹ گیا۔ اسی سال بطور اسٹاف آرٹسٹ، اسکرپٹ رائٹر آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھل کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں 1951ء تک رہے۔ 1951ء تا 1957ء اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر، کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹریٹ راولپنڈی رہے۔ جہاں سے 1957ء میں تبدیل کر کے بطور فلم آفیسر D.A.F.P کراچی بھیج دیا گیا۔ 1958ء تا 1960ء ویج اینڈ ڈائریکٹریٹ کراچی میں رہے۔ 1960ء میں قدرت اللہ شہاب (سیکرٹری برائے صدر پاکستان) کے او ایس ڈی کے طور پر ایوان صدر راولپنڈی آگئے۔ جہاں 1963ء تک رہے۔ اب ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر وزارت اطلاعات، راولپنڈی کر دیا گیا جہاں 1965ء تک کام کیا۔ 1965ء تا 1966ء [illegible] 1966ء [illegible]

آخری زمانے میں وزارت اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ سے متعلق تھے۔ [illegible] ہنڈرسل، ڈاکٹر ایڈلر اور ڈاکٹر یونگ نے متاثر کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ..... "جھکی جھکی آنکھیں" مطبوعہ "ادبی دنیا" لاہور 1936ء میں شائع ہوا۔

ممتاز مفتی کی تصنیفات

i۔ افسانوں کے مجموعے

1۔ ان کہی۔ 2۔ گہما گہمی۔ 3۔ چپ۔ 4۔ اسمارائیں۔ 5۔ گڑیا گھر۔ 6۔ روغنی پتلے۔ 7۔ سے کا بندھن۔ 8۔ کہی نہ جائے۔

منتخبات۔ سات مجموعوں کی کلیات۔

1- علی پور کا ایلی- 2- الکھ نگری

iii- سٹیج ڈرامے

1- نظام سقہ- 2- لوک ریت

vi- سفرنامے

1- لبیک (حج) 2- ہند یاترا

v- خاکوں کے مجموعے

1- پیاز کے چھلکے- 2- اوکھے لوگ- 3- اور اوکھے لوگ-

vi- مضامین کے مجموعے-

1- غبارے- 2- رام دین

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد ریڈیائی ڈرامے' ریڈیائی فیچر' نشری تقریریں' مضامین اور خاکے غیر مرتب صورت میں بکھرے پڑے ہیں-

مستقل پتہ- مکان نمبر22 سٹریٹ ایف 1/6 اسلام آباد

اعزاز: ستارہ امتیاز' حکومت پاکستان- نقوش ایوارڈ طفیل ایوارڈ منشی پریم چند ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس بھارت)

نظریہ فن: ایک مرکزی خیال یا تاثر ضروری ہے- افسانے میں تاثر ہونا لازم ہے- اگر قاری کے دل میں تجسس پیدا کرے کہ پھر کیا ہوا' تو بہت اچھے"-

مکتوب 17نومبر 1984ء - بنام مرزا حامد بیگ سے اقتباس)

اس وقت ممتاز مفتی ہمارے افسانوی ادب کے افق پر ایک "نادر و نایاب چیز" کا درجہ رکھتے ہیں- بزرگی کے اعتبار سے چوتھے نمبر پر ہیں- حجاب امتیاز علی لگ بھگ 1903ء جلیل قدوائی مارچ 1904ء اشرف صبوحی دہلوی مئی 1905ء اور ممتاز مفتی 11 ستمبر 1905ء کی پیدائش ہیں-

افسانہ نویسی (جسے مفتی کے حوالے سے افسانہ طرازی کہنا چاہیے) کا آغاز قدرے تاخیر سے ہوا یعنی انھوں نے اپنا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" (مطبوعہ: "ادبی دنیا" لاہور 1936ء) تیس برس کی عمر میں لکھا- سگمنڈ فرائڈ دستوئسکی اور ڈاکٹر یونگ ان کے پسندیدہ مصنف رہے ہیں یہی سبب ہے کہ چوہدری محمد علی ردولوی ' احمد علی اور شیر محمد اختر کے فوراً بعد سگمنڈ فرائڈ کی نشان زد کردہ نفسیاتی الجھنوں سے متعلق ممتاز مفتی نے "ان کہی" (طبع اول: 1943ء) "گہما گہمی" (طبع اول: 1944ء) چپ (طبع اول: 1947ء) اور "اسمارائیں" (طبع اول:1953ء) کے بیشتر کرداری افسانوں میں فرائڈین افکار کو سمیٹنے کا جتن کیا گو میں ذاتی طور پر اس خیال کا حامی نہیں کہ مفتی نے کلی طور پر فرائڈ کی کیس ہسٹریز یا ڈاکٹر یونگ کے روزمرہ مشاہدات کو اپنے افسانوں کی بنیاد بنایا- مفتی کے ہاں فرائڈ سے استفادے کی وہ صورت بھی دکھائی دیتی ہے جو ڈی - ایچ لارنس کے ہاں جلوہ نما ہے - یعنی انسان کو جنسی محرک کا ایک کرشمہ دکھا کر عورت اور مرد کی باہمی کشمکش کو نیا میدان فراہم کر دیا- اس ضمن میں مفتی لذت گیر الجھن پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے - ممتاز مفتی نے براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع کر کے جنسی کجرویوں کے لاشعوری محرکات کا ٹھوس علمی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے- جب کہ ممتا اور نسائیت کی تلاش اس پر ایک اضافہ ہے جھکی جھکی آنکھیں" اور "آپا" سے چلتے چلاتے یہ سلسلہ "دیکھن دکھن" اور "سمجھوتہ" (تا حال آخری افسانہ مطبوعہ فنون 1989ء) تک پہنچ کر اپنا دائرہ مکمل کرتا ہے-

مفتی کے افسانوں کی بڑی تعداد نوجوان جذبوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنوں پر مبنی ہے اور آخر میں آتے آتے اس بنیادی لہر میں طویل مشاہداتی اور عملی تجربہ بڑے سلیقے سے گھل مل گیا ہے - ایسے مقامات پر ہجری جمیز اور ممتاز مفتی کا تقابلی مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے- مفتی کے پچانوے فی صد افسانے کرداری ہیں اور انھوں نے بیانیہ کی تکنیک اپنائی ہے- لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر نوع کے کرداری افسانوں کے لئے بیانیہ کی تکنیک ہی مناسب ہے؟ بہت ممکن ہے کہ اس سوال نے مفتی صاحب کو بھی کبھی پریشان کیا ہو اور یوں وہ "چکٹ گاڑی ہو نکا ہوٹر اور موم بتی" جیسا یکسر مختلف افسانہ لکھ پائے ہوں - لیکن اس سلسلے کو انھوں نے آگے بڑھایا- بہت ممکن ہے ان کے مخصوص اسلوب نے ان کا راستہ روکا ہو- لیکن اس ناچیز کی رائے میں ان کا یہ یکسر مختلف طرز کا افسانہ "آپا" کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہے-

"روغنی پتلے" تک مفتی کے افسانوں میں دو طرح کے کردار بہت نمایاں ہیں - یعنی ایک تو وہ جو مفتی کے ایام جوانی کی یاد دلاتے ہیں جیسے "ماتھے کا تل" اور "اسمارائیں" جب کہ دوسرے کردار ایسے ہیں جو جدید عہد سے متعلق ہیں- جیسے "آدھے چہرے" کے کردار --- لیکن "سے کا بندھن" تک آتے آتے ممتاز مفتی نے قدیم ماضی میں غوطہ لگایا ہے اور ہندی کلچر سے مخصوص افتاد طبع کے حامل ٹائپ کردار ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں- یہاں میرا اشارہ "اپرا حویلی"

باقی صفحہ 23 پر

میں نے جب "چہار سو" میں جناب ممتاز مفتی کا گوشہ مرتب کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار احباب سے کیا۔ گرچہ میری خوش خیالی کی احباب نے داد تو دی کہ مفتی صاحب کے گوشے سے چہار سو کی چاروں سمتیں واقعی چمک اٹھیں گی۔

مگر میاں تمہارے قدموں تلے تو ابھی زمین بھی نہیں۔ اور دیکھنا شروع کردیا آسمان کی طرف۔ زمین و آسمان کے درمیان حائل فاصلہ دیکھ کر اپنی کم مائیگی کا احساس ضرور ہوا۔

لفظوں اور ارادوں کے رابطوں پر اعتماد بھی تھا۔ سب سے بڑا بھروسہ خود حضرت مفتی کی ذات گرامی تھی۔ جس کی حیثیت اردو ادب میں صاف و شفاف بہتے دریا کی سی ہے۔

مگر اب وقت یہ تھی کہ جناب ممتاز مفتی آج کل صاحب فراش ہیں۔ ایسی حالت میں زحمت دینا صریحاً گستاخی تھی۔

دعا دیتا ہوں اپنے اس دوست کو جس نے بھی میری خواہش ممتاز مفتی تک پہنچائی اور میری خوشی کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب میرے سپنوں کے مہابلی' نے خود اس ناچیز کو فون کرکے نہ صرف انٹرویو کی حامی بھری۔ بلکہ گوشہ مفتی کے لئے مکمل تعاون کا یقین بھی دلایا۔

15 مئی 1992ء میری زندگی کا قیمتی دن تھا جب "مفتی صاحب" نے ادب کے اس ادنیٰ طالب علم کو تین گھنٹے مسلسل اپنی گھنیری چھاؤں میں سمیٹے رکھا۔ وہ میری زندگی کے یادگار لمحے تھے جب ہر چند منٹ بعد فون کی گھنٹی پر بچہ آپ کو پیغام دیتا فلاں صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ جواب میں ہنس کر فرماتے ان سے کہو مفتی اس وقت ایک قصائی کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ گر بچ گیا تو خود فون کرے گا۔ کیا واقعی کوئی آدمی اتنا بڑا بھی ہو سکتا ہے۔ یقیناً مفتی صاحب کو دیکھ کر حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے۔

ماشاء اللہ 87ء کے سن میں بیماری اور ضعف کا اس خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہے ہیں جیسے یہ سب کچھ دوستوں اور عزیزوں سے مزاج پرسی کے مزے لوٹنے کا بہانہ ہو۔ خداوند کریم سے دست بہ دعا ہوں کہ ادب کے اس شجر پر بہار کی بہار کو تادیر قائم رکھے (آمین)۔ میں جناب ممتاز مفتی کی اس بے پناہ محبت و عنایت کے جواب میں ان کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ بلکہ فخر کرتا ہوں۔ خود پر اور "چہار سو" پر"۔ رشک کرنے کا حق آپ کو بھی ہے۔

سوال نمبر1۔ پہلی کہانی ایک دوست کی تحریک پر لکھی جو کہ پسند کی گئی۔ آپ کے خیال میں آپ کے فن کی اساس کیا ہے؟ God gift ہے۔ زندگی کے تجربات و مشاہدات کی بنا پر سفر جاری ہے یا کہانی آپ سے خود کو لکھواتی ہے۔

جواب نمبر1۔ نہ ادب لکھنا آتا تھا۔ نہ ادب کا شوق تھا۔ نہ اردو زبان آتی تھی۔ نہ کہانی اپنے آپ کو خود لکھواتی ہے۔ نثرنگاری مشقت کا کام ہے مگر ہم ادیب لوگ فلسفہ بہت بگھارتے ہیں۔ میرے پاس ایسی کوئی بات نہیں۔

سوال نمبر2۔ کامیاب ادیب بننے کے لئے عملی زندگی میں ناکام ہونا ضروری ہے کیا؟

جواب نمبر2۔ یہ سوال بے معنی ہے۔ ادیب بننے کے لئے عملی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اپنی کتاب "اوکھے لوگ" میں یہ بات بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادیب لوگ ذرا Difficult ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا جانتے ہیں نہ اپنے ساتھ۔ ادیب اور عام آدمی میں یہی فرق ہے۔ ادیب میں شدت زیادہ ہوتی ہے۔ حسیات (Sensitivity) زیادہ ہوتی ہے۔ زیادہ لکھتا ہے' زیادہ سنتا ہے۔ زیادہ محسوس کرتا ہے۔ جو Hyper Intelligence اور Hyper Sensitivity دونوں بلیڈ کی طرح ہوتی ہیں جو دوسروں کو بھی کاٹتی ہیں اور خود کو بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب زندگی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ نہیں کرپاتا۔

سوال نمبر3۔ کیا کوئی اعلیٰ درجہ کا ادیب غیر ترقی پسند بھی ہو سکتا ہے؟

جواب نمبر3۔ یہ بڑی فضول سی بات ہے۔ میں شروع سے ترقی پسندوں کے خلاف رہا ہوں۔ یہ ایک سیاسی تحریک تھی۔ انہوں نے خود کو روٹی کپڑا' مکان پر محدود کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مذہب کے حق میں نہ تھے۔

میرے نزدیک ادب کا مقصد مادی آسائش نہیں ان لوگوں نے چالاکی سے اس کا نام رکھ دیا ترقی پسند۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ مزدور کے حق میں لکھو اور سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ یہ کیپٹلزم (Capitalism) کے خلاف پروپیگنڈہ تھا جسے ہر ملک میں روس کنٹرول کرتا تھا۔ میں اس کے خلاف اس لئے تھا کہ یہ ادبی تحریک نہ تھی بلکہ سیاسی تحریک تھی۔

سوال نمبر4۔ کوئی تحریر کہاں جا کر عریانی اور فحاشی کے زمرے میں آتی ہے؟

جواب نمبر4۔ قاری خود جاتے ہیں' تحریر نہیں جاتی۔ ادب میں کچھ لکھنے والے جنسیات پر بات کرتے ہیں۔ مثلاً میں کرتا ہوں' منٹو کرتا تھا' فحاشی کا اپنا اپنا تصور ہوتا ہے۔ مولوی کے نزدیک سر پہ دوپٹہ نہ لینا فحاشی ہو سکتی ہے۔ اور میرے نزدیک برہنگی بھی فحاشی نہیں ہوتی۔ یہ اپنے اپنے ذہن کی اپروچ ہے۔ البتہ جنس کے علم کو عام ضرور ہونا چاہئے۔ فحاشی ایسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب لکھنے والے کا مقصد لذت ہو۔

سوال نمبر5۔ محبت اور نفرت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

جواب نمبر5۔ پھر وہی بات میری جان محبت اور نفرت دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں جذباتی کیفیتیں ہیں۔ دونوں میں شدت ہوتی ہے۔ جذبات جب چھڑجاتے ہیں تو پتہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ نفرت ہے یا محبت۔ اظہار کرنے کے بعد ہی فیصلہ ممکن ہے۔ وصل جو ہے اس کا محبت سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں وصل آگیا وہاں محبت ختم۔ جسمانی ملاپ محبت کا دشمن ہے۔ اصل محبت خواہش کے بغیر ہوتی ہے۔

سوال نمبر6۔ آزادی اظہار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ لامحدود ہونا چاہئے؟

جواب نمبر6۔ آزادی اظہار ایک سیاسی یا صحافی نقطہ نظر ہے جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی چیز کے اظہار آزادی کے وقت لوگ یہ کہتے ہیں تو میں اس سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہ حکومت وقت کے خلاف لکھنے کی آزادی مانگتا ہے۔ بہرحال آزادی بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ مذہبی آزادی' ادبی آزادی' اور معاشرتی آزادی۔ یہ سوال تفصیلی ہونا چاہئے۔

سوال نمبر7۔ ناول' افسانے' ڈرامے اور شاعری میں سے کس صنف کو آپ سب سے افضل سمجھتے ہیں۔

جواب نمبر7۔ سب سے بڑا فن شعرو سخن ہے۔ میرے نزدیک اس سے بڑا فن کوئی نہیں۔ ہر نیا خیال' ایجاد' تھیوری' سائنسی اصول کا اظہار سب سے پہلے شعر سخن میں آتا ہے۔

سوال نمبر8۔ انگلستان اور امریکہ میں آج وہ انگریزی نہیں لکھی جارہی جو پچھلی صدی میں لکھی گئی۔ اردو کی لسانی تشکیل میں آپ کا بہت حصہ ہے۔ اس کی نشاندہی فرمائیں۔

جواب نمبر8۔ بھئی بات یہ ہے کہ ہر زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے۔ اس میں اردو انگریزی کا کوئی سوال نہیں۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو نہیں بدلو گے تو پیچھے رہ جاؤ گے۔ اردو بھی اپنے آپ کو بدل رہی ہے۔ میرے خیال میں اردو کو اپنے اندر سندھی' بلوچی' پنجابی اور پشتو کو زیادہ سے زیادہ سمونا ہوگا۔ مثال کے طور پر انڈیا کے شہر بریلی میں بانس پیدا ہوا کرتے تھے اور سارے ملک میں بھیجے جاتے تھے۔ کوئی بریلی میں کہیں سے بانس لے آیا تو لوگوں نے محاورہ بنالیا کہ الٹے بانس بریلی کو۔ اب لوگوں کو اس محاورے کے بارے میں کیا پتہ۔ بہرحال اردو کا معیار بڑھا ہے اور خاص کر پنجاب' سندھ اور سرحد نے اردو کو ان۔رچ (Inrich) کردیا ہے۔

سوال نمبر9۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا کہ میں انگریزی میں سوچتا' اردو میں لکھتا اور پنجابی بولتا ہوں' اس تضاد نے آپ کی تحریر پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں یا مثبت؟

جواب نمبر9۔ دیکھیں مجھے اردو زبان نہیں آتی یہ بات میرے لئے بیک وقت بہت بڑی بدقسمتی اور بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ اگر آپ کو اردو زبان آتی ہے تو آپ اپنے خیالات کا اظہار بندھے ٹکے محاوروں میں بیان کردیتے ہیں۔ بندھے ٹکے رسمی محاورے آپ کے خیالات کو پورے طور پر بیان نہیں کرسکتے۔ آپ کی تحریر میں شگفتگی نہیں آئے گی۔ باسی پن محسوس ہوگا۔ آپ کی تحریر مشکل ہوجائے گی اور سادگی اور روانی نہیں رہے گی۔ زبان نہ آنے کی صورت میں نئے محاورے نئے انداز تلاش کرو گے جس سے حسن کی دریافت ہوگی اور نئی بات بھی پیدا ہوگی۔ ایک دفعہ میں اشفاق احمد کے پاس گیا اور کہا یار اشفاق مجھے اردو نہیں آتی تو مجھے پنجابی کے ایسے لفظوں کی فہرست بنا دے جو اردو میں بھی مستعمل ہوں۔ اس نے ایک کتاب چھاپ دی عنوان تھا "اردو کے خوابیدہ الفاظ" جب اس کتاب کو اردو بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کتاب چھاپنے پر اعتراض کیا۔ ان کے خیال میں یہ کتاب بے معنی تھی۔ ان سے کہا جناب جو پنجابی ادیب اردو زبان لکھتے ہیں ان کے لئے آسانی پیدا ہو۔ جواب میں بورڈ کے ارکان نے فرمایا کہ کون کہتا ہے یہ الفاظ اردو میں مستعمل ہیں جواب میں اشفاق احمد نے "نوراللغات" کا حوالہ دیا جو اردو کی تسلیم شدہ لغت ہے۔ اس میں ان لفظوں کو مستعمل قرار دیا گیا ہے۔ جواب میں بورڈ نے کہا کہ یہ بالکل مستعمل نہیں ہیں یہ اتھارٹی ہم اہل زبان ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں یہ الفاظ پہلے مستعمل تھے اب نہیں ہیں۔

سوال نمبر 10۔ خواتین تخلیق کا سرچشمہ ہیں مگر ہمارے ادب میں خواتین اہل قلم کی تعداد بہت کم ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب نمبر 10۔ تخلیق کا مطلب تو تخلیق ہی ہے۔ اس سے لکھنے کا کوئی تعلق نہیں۔ ملکی حالات کے حوالے سے یہ تعداد بھی زیادہ ہے جو تخلیق قدرت نے ان کے ذمہ لگائی ہے اس کا رزلٹ بارہ کروڑ کی صورت میں سامنے ہے۔

سوال نمبر 11۔ تخلیقات کے معیار اور مقدار کے لحاظ سے آپ کو اردو ادب میں قابل رشک مقام حاصل ہے' ذاتی طور پر آپ اس سے مطمئن ہیں۔

جواب نمبر 11۔ تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ کس نے کہہ دیا تم سے کہ میں اردو ادب میں قابل رشک مقام پر ہوں۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ تمام خیالات کا اظہار کر بھی نہیں پایا البتہ اتنا ضرور ہے کہ جو بات میں کہنا چاہتا تھا شاید ابھی تک کہہ نہیں پایا۔ یہ مقام قابل رشک نہیں سمجھا جا سکتا۔

سوال نمبر 12۔ کیا آپ اپنی ادبی اور غیر ادبی زندگی سے مطمئن ہیں؟

جواب نمبر 12۔ بھئی زندگی میں' میں نے بہت کچھ دیکھا ہر قسم کا تجربہ حاصل کیا۔ مجھ سا خوش قسمت کون ہوگا۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ میری کوئی حسرت باقی نہیں۔ تمام انسانی جذبوں سے آشنا ہو کر پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ زندگی بڑی خوبصورت ہے اس کے تمام دکھ درد اور خوشیاں بہت ہی خوبصورت ہیں۔

سوال نمبر 13۔ ملک میں ادب کے فروغ کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ سرکاری ادارے مثلاً ریڈیو' ٹیلی وژن اپنا کردار احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں

جواب نمبر 13۔ سرکاری اداروں کو ادب کا پتہ ہی نہیں وہ تو پریشر گروپ کو مانتے ہیں۔ ادیبوں کو تو گھاس بھی نہیں ڈالتے تو ہماری تجاویز کو کیا جانیں گے۔ اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگا لیں کہ آج تک کسی وزیر نے سامع کی حیثیت سے کسی ادبی تقریب میں شرکت نہیں کی۔

سوال نمبر 14۔ آپ ماشاء اللہ ہندو پاک کے بہت ہی سینئر افسانہ نگار ہیں۔ بیشتر لوگوں کا عمر بڑھنے کے ساتھ نوجوان نسل سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جبکہ آپ کے قارئین کی اکثریت اب بھی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

جواب نمبر 14۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی میں ہمیشہ میری یہ ہی کوشش رہی ہے کہ اپنے اندر معززیت پیدا نہ ہونے دوں۔ جو لوگ معزز بن جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو بہتر اور برتر سمجھنے لگتے ہیں اور اس واسطے ان کا رابطہ نوجوان نسل سے ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ اب وہ نصیحت کا رشتہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔ یہ اگر ادیب میں پیدا ہو جائے تو وہ ری فارمر (Refarmer) بن جاتی ہے۔

سوال نمبر 15۔ کیا آپ موجودہ اردو افسانے کی کیفیت سے مطمئن ہیں؟

جواب نمبر 15۔ میں پکا تا ضرور ہوں چکھتا بالکل نہیں یہ کام نقاد کا ہے۔ نقاد پر چھوڑ دیں۔ فی الحال تو میں کم از کم نقاد نہیں ہوں۔ دنیا میں نئی چیزیں پیدا ہوتی رہیں گی اور افسانے میں بھی تبدیلی آتی رہے گی اور تبدیلی بہت ضروری ہے۔ یہ وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ کون سی چیز کو دوام حاصل ہے اور کون سی چیز کو نہیں۔

سوال نمبر 16۔ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں سے آپ کا پسندیدہ افسانہ نگار

جواب نمبر 16۔ ذاتی طور پر بیدی سے بہت متاثر ہوں۔ میرے نزدیک بیدی بہت بڑا لکھنے والا تھا۔ اس کی بد قسمتی کہ وہ فلم لائن میں چلا گیا اگر ڈاک خانے میں رہتا تو بہت بڑا تخلیق کار ہوتا۔ فلمی دنیا کی (ایفلونس) اور عیاشی کی زندگی اسے گھن کی طرح کھا گئی جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔

سوال نمبر 17۔ افسانے میں کہانی پن کے عنصر کی کیا اہمیت ہے؟

جواب نمبر 17۔ میرے خیال میں افسانے میں کہانی پن کا عنصر لازم ہے۔ میرے نقطہ نظر سے یہ ضروری ہے کہ قاری سوچے اب کیا ہوگا۔

سوال نمبر 18۔ کیا ہم کسی ادیب کی تحریر کو اس کی ذاتی زندگی سے الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں؟

جواب نمبر 18۔ ضروری نہیں کہ ناصح صاحب عمل بھی ہو۔

سوال نمبر 19۔ نئی نسل کے بارے میں آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے۔

جواب نمبر 19۔ نئی نسل زیادہ حساس ہے۔ زیادہ ذہین ہے زیادہ صلاحیتوں کی مالک' ذہنی طور پر زیادہ ویل ان فارم (Well in form) ہے اور ہماری طرح (بیورو کریٹ) نہیں ہے۔ اس وقت نئی نسل کو گمراہ کرنے میں سیاستیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ بہر طور میرا ایمان ہے کہ جو کچھ بھی کرنا ہے وہ نئی نسل ہی کرے گی۔

سوال نمبر 20۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اپنی کہانی "سے کا بندھن" بہت پسند ہے کیا یہ درست ہے؟

جواب نمبر 20۔ اس سوال کا جواب میں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کروں گا یہ کہانی مجھے کیوں پسند ہے۔

آوازیں

ممتاز مفتی

مجسمہ ساز سے کسی نے پوچھا اپنے فن کی بات بتا۔ وہ بولا میں بھید کا تو مجھے پتہ نہیں میں مجسمے بناتا ہوں۔ تو دوستو! میں تو کہانیاں لکھتا ہوں بھید جانیں میرے دشمن یہ دھندا کرتے پورے چوالیس سال ہو گئے ان چوالیس سال کے دوران میں بھید بھیوں کی بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دیں پہلے میں نے ان آوازوں کو بڑی توجہ سے سنا بڑی سنجیدگی سے پلے باندھا پھر جو ایک دن پلا کھولا تو دیکھا کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ آئیں بائیں شائیں پھر ایک زمانے تک انہیں نہ سننے کی ناکام کوشش میں لگا رہا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ سنتا ہوں ہنس دیتا ہوں۔

جب یہ بھید کھل جائے کہ بات کرنے والے کا مقصد بات کرنا نہیں ہوتا بلکہ خود اپنی آواز سننا ہوتا ہے اپنی اہمیت جتانا ہوتا ہے تو باتیں سننے والے کے دل میں تلخی پیدا نہیں کرتیں۔

پتہ نہیں کس عالم نے کہا تھا خدا بن کر بیٹھ جاؤ کوئی تعریف کرے تو ہاتھ پاؤں نہ پھولیں کوئی برا بھلا کہے تو غصہ نہ آئے۔ تلخی پیدا نہ ہو دوستوں یقین جانو جب تک خدا نہ ہو گے تخلیق کار نہ بن سکو گے۔

میری تحریروں کے متعلق جو جو آوازیں میں نے سنیں گذشتہ چوالیس سال میں انہیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

سب سے پہلی تحریر میں نے 1935ء میں لکھی۔ عنوان تھا جھگڑا' نفس شاعر اور غیر شاعر کا جھگڑا یہ تحریر میں نے اس لئے نہیں لکھی تھی کہ مجھے لکھنے کا شوق تھا بلکہ اس لئے کہ میرے افسر نے حکم دیا تھا کہ لکھتو' چونکہ اسکول کے میگزین میں جگہ پری کی ضرورت تھی۔ ان دنوں میں گوجرہ ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔

پتہ نہیں کیسے یہ تحریر منصور احمد کی نظر سے گزری تحریر اچی تو نہ تھی پتہ نہیں منصور نے اسے کس آن میں دیکھا کہ انہوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ ادبی دنیا کے لئے لکھو۔ یہ خط مجھے لے ڈوبا۔ ڈوب جاتا تو بھی تھا۔ آج تک ڈبکیاں کھا رہا ہوں۔

منصور احمد کے کہنے پر میں نے اپنی پہلی کہانی لکھی جھکی جھکی آنکھیں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے کہانی لکھنے کا شوق تھا یا میں ادیب بننے کا خواہشمند تھا۔ بلکہ اس لئے کہ آیا اتنے بڑے ماہنامے کے اتنے بڑے ایڈیٹر نے مجھے اہمیت دی تھی میں اہمیت کا بھوکا تھا۔ اسی لئے منصور احمد کا خط پڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

پھر وہ کہانی ادبی دنیا کے سالنامے میں چھپی اکیلی نہیں ساتھ پورے ایک جہازی صفحے کا تعریفی نوٹ بھی ہاتھ پاؤں پہلے ہی پھولے ہوئے تھے۔ تعریفی نوٹ دیکھ کر آنکھیں پھٹ گئیں۔

پھر یہ قیامت ٹوٹی کہ منصور احمد میری ایک کہانی چھاپ کر خود اللہ کو پیارے ہو گئے اور مجھ پر لکھنا عائد کر گئے۔ ایک بار تالی بجی دوسری بار سننے کی ہوس جاگ اٹھی۔

لکھنا میرے بس کی بات نہ تھی میرے لئے خالص مشقت تھی۔ خیالات تو تھے لیکن زبان سے کورا تھا۔ رو رو کر لکھا کرتا۔

دوسری کہانی بھیجی تو ادبی دنیا کے نئے ایڈیٹر نے اسے رد کر کے واپس بھیج دیا مسودے پر سرخ لکیروں سے راستہ تلاش کرو کا نقشہ بنا ہوا تھا نیچے لکھا تھا کوئی طبع زاد چیز لکھئے۔

اگر تالی کا بھوکا نہ ہوتا تو بات وہیں ختم ہو جاتی بہرحال لکھتا رہا۔ رو رو کر لکھتا رہا۔

پھر دلی کا ایک ادبی پرچہ مل گیا ساقی جسے شاہد احمد چلاتے تھے وہ کہانی بن پڑھے چھاپ دیتے تھے۔ سو وہاں چھپتا رہا۔ چھپتا رہا۔

پھر آہستہ آہستہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ مفتی کون ہے۔

غالبا لڑکی ہے۔

نہیں محض قلمی نام ہے۔

مفتی نفسیاتی کہانیاں لکھتا ہے

مفتی کے موضوعات ہٹ کر ہوتے ہیں۔

مفتی نفس لاشعور سے پردے اٹھاتا ہے

مفتی منفرد ہے

مدھم مدھم آوازیں آتی رہی' آتی رہیں۔ کسی نے دو بدو ہو کر بات نہ کی۔ دو بدو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ مفتی بھی کسی ادبی

محفل میں دیکھا نہ گیا تھا کہیں پایا نہ گیا تھا۔

جریدے میں ایک نام کے سوا اس کا کوئی وجود نہ تھا مدرسے میں میں ممتاز حسین تھا اور ممتاز حسین نے خود کو کبھی ممتاز مفتی کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا۔

پھر ایک اور قیامت ٹوٹی ممتاز مفتی اہل زبان کی توجہ میں آ گیا اور آوازوں کا ایک طوفان اٹھ آیا۔

مفتی زبان سے ناواقف ہے۔

مفتی محاورے سے نا آشنا ہے۔

مفتی اردو زبان کے صاف شفاف پانی کو گدلا کر رہا ہے اسے روکو۔

مفتی کو چاہئے کہ وہ کسی اور زبان میں لکھے۔ چونکہ وہ اردو سے عاری ہے۔

آہستہ آہستہ ہمدردانہ آوازیں مدھم پڑتی گئیں تلخ آوازیں ابھرتی آئیں۔

پھر ایک درسی پبلشر کی ضد کی وجہ سے میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ان کہی چھپ گیا۔ ممتاز حسین کا بھانڈا پھوٹ گیا ممتاز مفتی سامنے آ گیا اس پر اساتذہ کرام نے مجھے پاس بٹھا کر بڑی ہمدردی سے سمجھایا کہ ایسی خرافات لکھنا ایک استاد کو زیب نہیں دیتا۔ بچوں کے ماں باپ کو پتہ چل گیا تو وہ وفد لے کر محکمہ تعلیم سے مطالبہ کریں گے کہ مدرسے کے پاکیزہ ماحول کو خراب کرنے والوں پر سخت ایکشن لیا جائے۔

ابھی محکمے کا جھگڑا نپٹا نہ تھا کہ ترقی پسندی کی کالی گھٹا دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف چھا گئی۔ پہلے ہم سمجھے کہ ادبی تحریک ہے پھر پتہ چلا سیاسی ہے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ادیبوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

ترقی پسندوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا کہ زندگی میں صرف ایک ہی مسئلہ ہے۔ وہ معاشی مسئلہ۔ روٹی' کپڑا اور مکان دنیا میں صرف ایک عالم ہے کارل مارکس' انسان کے لیے صرف ایک مسلک ہے سوشلزم' ادب کے لیے صرف تین موضوع ہیں مزدور' فیوڈل ہاور امپیریل ازم۔ جو ادیب ان موضوعات سے ہٹ کر لکھیں گے بلا شک و شبہ وہ رجعت پسند ہیں۔ ڈاون ود REACTRIOU ARIES ادیب کے اس نئے مفہوم کی روشنی میں ہر لکھنے والے کو از سر نو جانچا گیا۔

مفتی کے متعلق پھر آوازیں اٹھائی گئیں۔

مفتی رجعت پسند ہے۔

نفسیات کوئی علم نہیں چند مفروضوں کا نام ہے مفتی تلذذ کا رسیا ہے وہ جنسیات پر لکھتا ہے۔ مفتی ایک ORSCEUCE رائٹر ہے۔

مفتی کے موضوعات زندگی سے ہٹ کر ہیں۔ مفتی فن برائے فن کا قائل ہے اور فن برائے زندگی سے ناواقف

مفتی کو لکھنے والوں کی فہرست سے بین کیا جاتا ہے کوئی ادبی جریدہ مفتی کو نہ چھاپے ورنہ اس پر رجعت پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا جائے گا۔

مفتی فرائیڈ کا چیلا ہے۔

مفتی کی کہانیاں فرائیڈ کی کیس ہسٹریوں سے ترتیب پاتی ہیں۔

اگر مفتی عزت والا ہوتا تو لکھنے لکھانے سے توبہ کر لیتا اور باقی زندگی آرام اور چین سے بسر کرتا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ الٹا اس کے اندر کا خناس جاگ اٹھا۔ بولا میں رجعت پسند ہوں۔

مجھے اپنی رجعت پسندی پر ناز ہے۔

میں فن برائے فن کے لئے لکھتا ہوں۔ لکھتا رہوں گا لوگو بیشک مجھے نہ چھاپو' نہ پڑھو۔

لیکن مجھے لکھنے کوئی نہیں روک سکتا۔

ترقی پسند طاقت ور لوگ تھے۔ ان کی آندھی چلتی رہی مفتی خس وخاشاک کی طرح اس آندھی میں اڑتا رہا۔ طوطی کی مدھم آواز اس عظیم صحرا میں صدائے محل بنی رہی۔

پھر پاکستان بن گیا۔

ترقی پسندی کے سیاسی ناخداؤں نے حکم لگایا کہ اس تحریک کا مرکز ہندی میں رہے گا۔ پاکستانی ترقی پسندوں کی آنکھیں کھل گئیں! جزبہ حبالوطنی غالب تھا وہ سب مستعفی ہو گئے۔

یوں پاکستان کے سر سے ترقی پسندی کا بھوت اتر گیا۔ لیکن اس دوران میں افسانے کی گڈی جو پہلے چڑھی ہوئی تھی جھپ کھا کر گر پڑی۔

مفتی نے اپنی آپ بیتی لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک ایسی آپ بیتی جس میں بھونڈا ننگا سچ ہو افسانہ سازی نہ ہو' عبارت آرائی نہ ہو۔

1962ء میں علی پور کا ایلی شائع ہوا تو پھر سے آوازیں بلند ہوئیں۔

علی پور کا ایلی ناول ہے۔

نہیں وہ ایک روئیداد ہے۔

نہیں وہ جنس سے بھرا ہوا ایک لوتھڑا ہے۔

نہیں وہ ایک حقیقت پسند دستاویز ہے۔

نہیں وہ ایک خرافات کا پلندہ ہے۔

نہیں وہ ایک آپ بیتی ہے۔

ناولوں کا گرو گھنٹال ہے۔

ان آوازوں میں اوئے اوئے بھی تھی واہ واہ بھی۔ دس اوئے اوئے کے بعد ایک واہ کچھ دیر کے لیے یہ آوازیں گونجیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آٹھ دس سال کے بعد جب میں نے حج کی روئیداد لبیک لکھی۔ تو ایک طوفان آگیا۔ آوازیں ہی آوازیں۔ آوازیں ہی آوازیں۔ حیرت آوازوں پر نہ تھی۔ اس بات پر تھی کہ زندگی میں پہلی بار مثبت آوازیں سن رہا تھا۔ اتنی واہ واہ میں تو شاک ہو گیا۔ اس ایک تحریر پر مجھے تقریباً بیس ہزار خط موصول ہوئے ہوں گے۔ عمر بھر ادیبوں کے لیے لکھا اور کڑوی کسیلی کے سوا کچھ نہ پایا۔ عوام کے لیے صرف ایک کتاب لکھی انہوں نے مجھے پھولوں سے لاد دیا۔ اس حد تک کہ صرف مشک کافور کی کسر باقی رہ گئی۔ ستر کی دہائی میں پھر افسانے نے کروٹ کی اور افسانے کی سرزمین پر علامتے یوں ابھرے جیسے برسات میں کھمبیں اگتی ہیں۔

علامتیوں نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ وقت آگیا ہے کہ حقیقت پسند اور رومان پسند افسانوں کی خس و خاشاک سے اس سرزمین کو پاک اور صاف کر دیا جائے چونکہ اب افسانے کو علامت کا چھوا لگ گیا ہے۔ اور ڈھل بیکار ہیں۔

ادھر علامتیے آتے ادھر پھر سے مار کیوں نے سازؔ اٹھایا۔ کمٹمنٹ کمٹمنٹ، تشدد غم و غصے کے بل ادب کے ایریے میں آگھسنے پر والا کی محفل میں جز مبسوں مبسوں کرتا آیا۔ بولا میں تو پروانہ ہوں۔ میں بھی پروانہ ہوں۔

پروانے پہلے گھبرائے یہ کیسا پروانہ ہے۔

پھر ڈر گئے۔ بولے شاید پروانہ ہی ہو۔ کیا پتہ پھر ایک بوڑھا پروانہ آگے بڑھا۔ بھڑ سے بولا میاں پروانے ذرا جا کر دیکھ آ کیا شہر کی بتیاں روشن ہیں۔

آدھ گھنٹے کے بعد بھڑ بھوں کرتا ہوا واپس آگیا۔ بولا شہر کی بتیاں جل رہی ہیں۔

اب مفتی کی تحریروں پر صرف آواز سے ہی بلند نہیں ہوتے۔ ساتھ آستینیں بھی چڑھائی جاتی ہیں۔ مونچھ مروڑ کر کہا جاتا ہے شہزاد سے باز آجا۔

زندگی کا اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد سے ادب کے متعلق صرف ایک بات پائی جاتی ہے۔ میری وصیت ہے کہ میرے مرقد پر جلی حروف میں لکھا جاتا۔

من نہ کردم شما حزر بکنید

سمے کا بندھن

ممتاز مفتی

آپی کہا کرتی تھی: سنہرے، سمے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سمے پہچان، سنہرے اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی، آلنے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی۔ پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی: تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی، کٹھالی میں پڑے بنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی کوئی لایا تھا۔ بالپن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا امڈ امڈ آیا چھپائے نہ چھپتا تھا آپی بولی: نہ دھیئے، چھپانہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا۔

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی "یہ کیا کر رہی ہے بٹیا؟ سیانے کہتے ہیں، جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دیکھنا نہیں۔ دکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن، منظر بن اور جو دیکھے بھی تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ پھر سے دیکھ سنہرے ابھی تو شام ہے یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے دکھ کا سمے ہے۔ شام بھی گھنشام نہ آئے"۔ آپی گنگنانے لگی "یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے تیرا آنے کا سمے ہے پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہو گا۔ پچھلے پہر تک"۔

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھاکر کے کھلتا تھا۔

بولی "سنہرے، بوتل کھول، گلاس میں ڈال۔ چٹکی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے"۔ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی "دیکھ لڑکی، یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں تمیں دوجے میں اٹھے دوجے میں جھاگ اٹھانا ہی ہمارا کام ہے خود شانت، دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے، ہمارا سمے۔ جب کر دوجا شانت ہو جائے، سمجھ لے ہمارا سمے بیت گیا اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرنا ٹھمک نہ کرنا ٹھمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کا سمے گیا پایل نہ جھنکارنا۔ پایل جھنکار بیرن بھئی۔

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "سنہرے، میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا یہ بھیتر کی باتیں ہیں، اوپر کی نہیں، سنی سنائی نہیں، پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں، بادام نہیں ہوتیں جان لے بیتی بات وہ جو بھیتر کی ہو گری ہو۔ چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ بڈ بیتی۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا"۔

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں سانپ تو صرف ڈراتے ہیں پھنکارتے ہیں لکیریں کاٹتی ہیں ڈستی ہیں پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے چلتی ہیں چلے جاتی ہیں جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں: بجلی، روپ اور میں بجلی بڑی، روپ منجھلی اور میں چھوٹی بجلی میں بڑی آن تھی پرمان نہ تھا اس آن میں چھب تھی سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا یوں رعب سے بھری رہتی جیسے میار رس سے بھری رہتی ہے گردن اٹھی رہتی مورتی سمان۔

روپ سری سر تھی۔ شدھ سر تاروں سے بنی تھی اس کے بند بند میں تار لگے تھے سرتیاں سرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جلا دیتے۔ تبھی میں تھی آپی کہتی تھی: سنہرے، تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے پگلی دوجے کو ڈبویا کر، خود نہ ڈوبا کر مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اٹھایا اور چلا آیا بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر

بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتیے آتے تھے پر ایسے بد مزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیو نہ اچھلنا جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی وہ سمجھ لو' نظروں سے گر گئی پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے آواز چلتی تھی۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجیب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اندر جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم' گرم گرم' ویسے تھا آن بھرا مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی سجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھال نہ تھی جھکائے رکھتا پیتا ضرور تھا' پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا اتنا مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا نہ ہو' بھیتر کا ہو بوتل اک بہانہ ہو بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

"ذرو سکھیو ذرو۔ بھیتر کے نشے سے ذرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو بیج کھڑا ہو۔

بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ ذرو سکھیو ذرو بھیتر کے نشے سے ذور بوتل کا تو کام کاج جو گا نہیں چھوڑتا۔ بھیتر کا کسی جو گا نہیں چھوڑتا۔ خود جو گا بھی نہیں مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔"

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے "کا ٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی ری۔" گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ پھر کو' پھر بولو کا جاپ کئے جا رہا تھا نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کی سے پیتا جارہا تھا سے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی اس روز وہ سے ایسا ہی سے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی "شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔"

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ "نہ آپی" وہ بولا "ابھی تو رات بھیگی ہے آپی بولی ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سے بیت جاتا ہے جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی رہا کیا؟" ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ "آپی یہ سے کا گورکھ دھندا کیا ہے؟"

آپی بولی"لڑکیوں سے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک پھر بھور سے اس کا سے ہے اس کا نام جپو۔ اسے پکارو فریاد کرو دعائیں مانگو سجدے کرو اس سے میں تم عیش نہیں کر سکتے گناہ نہیں کر سکتے قتل نہیں کر سکتے یہ دھندا جو ہمارا ہے اس کے سے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو اس کے سے کے نیڑے تیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔

پھر وہ دن آگیا جب میں نے ان جانے میں سے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے "بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہوگی ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ تجھے لینے آیا ہوں چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ بولی "روپہ ماندی ہے وہ تو نہیں جا سکے گی۔ کسی اور سمے دن رکھ لینا نذر نیاز۔"

"خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں۔" وہ بولا

"تو کسی اور منڈلی کو لے جا۔"

"اونسوں ٹھاکر نے منھ بنا لیا "خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق کچھ تو ہو۔"

"میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منھ پر لاؤں۔"

"بس اک تیری بیٹھک ہے بائی جہاں پو ترتا ہے۔ جسم کا نہیں من کا ٹھکانا ہے۔"

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپہ کا دھیان رکھنے کے لیے بیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل گی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں' بہویں' بیٹیاں' ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو بھجن منڈلی تھی "خواجہ میں تو آن کھڑی تو رے دوار" سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں' دل ڈولے۔ آپی کا ڈوب ہی گیا ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا' شربت شیرا پلانے کو پھر وہیں لٹا دیا۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ میں حیران میں تو کچھ منگ نہیں رہی میں تو التجا نہیں کر رہی میں تو اک تاجر ہوں پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں خواہ مخواہ۔ سو میں بنا سوچے سمجھے گائے چلی گئی۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتہ تھا کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ' زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں' پر کوئی سنتا نہیں مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دیالو ہے اتنا نیڑے ہے اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھاکر بولا "سنہری بائی' بس اک آخری فرمائش: خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا۔"

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہی نہیں محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا کسی بات میں چت نہ لگتا بیٹھک بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا سارنگی روئے جاتی۔ استاد ممو خاں بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کر نکل جا وہاں' اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ کہ ھیں ھیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ بیلی حیران' روپہ کا منہ کھلا' آپی چپ یہ کیا ہو رہا ہے جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی: بس پتر' تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانا پانی ختم ہو گیا۔ تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔

"پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔"

"جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا" روپہ بولی۔

"اس بھیڑ میں جائے" آپی بولی "یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں' یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی' بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دل میں اک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں سر میں تیل مالش کروں اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں اس کی بنیانیں دھوؤں کپڑے استری کروں آرسی کا کول بناؤں پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی "اب کیا حال ہے دھیئے؟" میں رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی اک کی ہو جا۔

بولی "وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟"

"اونہوں۔ کوئی نظر میں نہیں"

"ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی"

"نہیں آپی"

"کوئی بات نہیں" وہ بولی "جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو کھونٹی بھیجے گا۔"

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی بولی "خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟"

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا سنہری بائی کو سنا تھا جب سے اب تک اس آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔

اب ہار کے تیرے در پہ آیا ہوں۔ بول تو کیا کہتی ہے منھ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مہینے کیلئے دیدے ایک سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے بخش دے جیسے تیری مرضی" آپی ہنسنے لگی۔ بولی" چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔"

"اونہوں" میں نے سر ہلادیا "نہیں آپی انہوں نے سمجھا ہے تو ٹھیک ہے دیکھنے کا مطلب؟"

"کتنی دیر کے لیے مانوں؟"

"جیون بھر کے لیے۔"

"سوچ لے۔ جو اوباش نکلا تو؟"

"پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا لوٹا دیا بولی "سودا نہیں کر رہی دھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے سنبھال کر رکھیو۔"

حویلی یوں اجڑی اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ سازوسامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے صوفے لگے ہوئے تھے۔ قد آدم آئنے جھاڑ فانوس سبھی کچھ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے' کہاں ہے' کیوں ہے۔

امبر سے شام آ رہی تھی۔ کے کوے سے ٹکراتی۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیے جلاتی بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پایل کی جھنکار بیرنیا ہو۔

دور اس کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نگاہیں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی' جو چھوٹی چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی' دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمین چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دو جوں کا محتاج بنا لیا تھا کیوں؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھ رہتی ہے سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔ اور پھر ٹوٹتی رات سے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا۔ پر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی' پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا الجھے الجھے خیال الجھاتے مجھے چمن سے اکھیڑا بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اب اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کوئی اس کے رو برو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟" وہ بولی۔

"میں ہوں پٹواری، چھوٹی چوحدرانی جی۔"

"تو جا، جا کر بڑی چوحدرانی سے مل مجھ سے تیرا کیا کام؟"

"آپ ہی سے کام ہے" وہ بولا۔

"تو بول کیا کہتا ہے؟"

"گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انھیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیں۔"

"ٹھہرا دو" وہ بولی۔

"نوکر چاکر بندوبست" وہ رک گیا۔

"سب ہو جائے گا۔"

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اسنے سر سری طور پر پوچھا "کہاں سے آئے ہیں؟"

پٹواری بولا "اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔ "اک دھماکا ہوا چھوٹی چوحدرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چوحدرانی نے جنت بی بی سے پوچھا۔ "جنت، یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟"

جنت بولی "لو چھوٹی چوحدرانی وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے۔"

"تو تیار ہو جا جنت ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔"

"چوحدرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔"

"تو چل تو سہی"۔ چوحدرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا "اور دیکھ وہاں مجھے چوحدرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی پیچھے پیچھے چوحدرانی تھی سفید ریش گھبرا گیا بولا "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔"

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے" چھوٹی چوحدرانی بولی۔

"تو پھر؟" سفید ریش گھبرا گیا۔

"ایک سوال پوچھنا ہے۔" چوحدرانی نے کہا۔

"سائیں بابا اس سے سوال کا جواب نہیں دی گے۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا انھوں نے پوچھنا ہے" وہ بولی۔

"کس سے پوچھنا ہے؟" خادم بولا۔

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔" یہ سن کر سفید ریش خادم سن ہو کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"ان سے پوچھو" چھوٹی چوحدرانی نے کہا "ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے: ہے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چوحدرانی بولی کہو وہ عورت پوچھتی ہے: تو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ۔" وہ رک گئی کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی "اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے: بول میرا جیون کس کام آیا؟" یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

"تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ "تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟" وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہو گئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

"میری طرف دیکھ" سفید خادم نے کہا "سنہری بائی، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ میں کیا تھا کیا ہو گیا۔"

چھوٹی چوحدرانی کے منہ سے ایک چیخ نکلی "استاد جی، آپ!" وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

"سنہری بی بی" وہ بولا "مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا۔"

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ ٹھاکر" وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا "اب ہمیں پتا چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔" اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا بولا "بی بی، ہمیں آشیرباد دے۔"

سمے کا بندھن

مجھے کیوں پسند ہے

ممتاز مفتی

پوچھتے ہیں تمہیں اپنا افسانہ سمے کا بندھن کیوں پسند ہے یہ سوال بے معنی ہے چونکہ پسند، نہ پسند کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔

اگر آپ مجنوں سے پوچھتے کہ میاں تجھے لیلی کیوں پسند ہے۔ تو وہ کہتا اسلئے کہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ اٹھتی اچھی لگتی ہے بیٹھتی اچھی لگتی ہے سوئی ہوئی اچھی لگتی ہے جاگتی اچھی لگتی ہے۔ گھورتی اچھی لگتی ہے۔ مسکراتی اچھی لگتی ہے۔

آپ ہر دلیل کو رد کر سکتے ہیں۔ لیکن "اچھی لگتی ہے"۔ ایسی دلیل ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ ہم خود کو عقلیہ حیوان سمجھتے ہیں۔ اسلئے اپنی پسند کو ریشنل بنانے کیلئے دلیلیں گھڑ لیتے ہیں۔ محبوب کی صفات گنتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ صفات کی وجہ سے محبوب نہیں ہوتا۔ چونکہ محبوب ہوتا ہے اس لئے صفات نظر آتی ہیں۔

میں بھی خود کو عقلیہ انسان سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں نے بھی چند ایک دلیلیں گھڑ رکھی ہیں کہ یہ کہانی مجھے کیوں پسند ہے۔

یہ کہانی وقت اور انسانی جذبات کے باہمی تعلق کے متعلق ہے۔

یہ تعلق بڑا پراسرار ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ اور یہ اداسی آہوں بھری نہیں چیخوں بھری ہوتی ہے۔ کیوں۔

شام کا راگ کلیان کیوں چیخیں مارتا ہے۔ پھر جوں جوں رات ڈھلتی ہے کلیان کے کرب کی تلخی بے چینی اضطراب کم اور درد پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ درد۔ بیراگ میں بدل جاتا ہے۔ سر بال لٹکائے بین کرتی ہیں۔

پھر بھور سے تمام دنیاوی دکھ درد دور ہو جاتے ہیں اور ایک بے نام ماورائی نور پھیل جاتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ عیش و طرب کی محفلیں رات کے پچھلے پہر ماند پڑ جاتی ہیں۔

صبح کاذب کے وقت آپ کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔ ڈاکہ نہیں ڈال سکتے۔ اس وقت جرم اور گناہ کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ گیان دھیان کیلئے پچھلا پہر مخصوص ہے۔ وہ وقت دعا ہے۔ کیا اس وقت اللہ تعالیٰ قریب آجاتے ہیں۔

پرانے زمانے میں جب مذہبی جذبات حاوی ہوتے تھے بیویاں مکمل پہری ہوا کرتی تھیں۔ ان میں شوہر سے ملاپ کی خواہش پچھلے پہر جاگتی تھی۔ آدھی رات کا ملاپ عام طور پر ناجائز ہوتا تھا۔

بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ پچھلے پہر کے نطفے میں مثبت خصوصیات ہوتی ہیں۔ صبر تحمل مٹھاس بردباری وفا شعاری۔ آدھی رات کے نطفے میں شدت ہوتی ہے اضطراب بے چینی۔

آج بھی دیہات میں عقیل اور لڑاکے افراد کو لوگ طعنہ دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تو تو دوپہر کا نطفہ معلوم پڑتا ہے وقت کے انسانی جذبات پر پراسرار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر وقت ایک بے معنی لفظ ہے۔ چونکہ وقت زمین کے اپنے محور کے گرد گھومنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور دنیا میں ہر سے ہر قسم کا وقت موجود ہوتا ہے۔ کہیں شام ہوتی ہے کہیں فجر اور کہیں آدھی رات۔

بچپن میں میں نے ایک ایسا واقعہ دیکھا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ گانے کی محفل تھی۔ بائی تھک گئی تھی۔ لیکن صاحب خانہ ایک فرمائش پر مصر تھے بول تھے:

مدینے میں مورسیاں بالا ہے رے\
بھر دے جام۔ کوثر سے احمد\
ساقی یہ کوثر والا ہے رے\
مدینے میں مورسیاں بالا ہے رے

یہ گیت ایسا چلا ایسا چلا کہ بائی کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ پھر سب کچھ چھوڑ کر مدینے جا بیٹھی۔

یہ کہانی مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ اس میں شہنشاہ ہند کا تذکرہ ہے۔ جنہوں نے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔

میں نے غریب نواز کے دربار میں ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اگرچہ حضور کی "نوازی" محدود نہیں پھر بھی وہاں امیر اپنی امارت پر شرمندہ تھے اور عوام اپنی غربت پر "مان" کر رہے تھے۔

چند ایک سال کی بات ہے کہ مجھے حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کی ایک محفل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کچھ چہرے جانے پہچانے تھے کچھ ان جانے لیکن ان جانے ہونے کے باوجود مانوس تھے چونکہ دانش وری کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ دانش وری کی چھاپ دانش ور پر نہیں لگتی۔ اس فرد پر لگ جاتی ہے جو سمجھتا ہے کہ میں دانشور ہوں۔ میری بیشتر زندگی ایسے دانشوروں میں گزری ہے۔

اس روز حلقہ کی محفل میں دفعتا میرے سامنے ایک چہرا آیا اور گزر گیا میں چونکا۔ ارے یہ کیا چیز ہے مجھے ایسا لگا جیسے شدھ راگ میں بے برجت "ممنوعہ" سر لگا ہو۔ جیسے موروں کے جھرمٹ میں فاختہ آگئی ہو۔ اس چہرے سے مٹھاس کی پھوار اڑ رہی تھی۔ اس کے وجود سے "میں تو کچھ بھی نہیں" کی زیرلبی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اسے سلام کروں۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ کچھ افراد کو دیکھ کر کسی وجہ کے بغیر دلیل کے بغیر مصلحت کے بغیر جی چاہتا ہے کے انہیں جھک کر سلام کریں۔

میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ یہ کون شخص تھا

حلقے کا ایک کارکن ہے اس نے جواب دیا

اس کے علاوہ میں نے پوچھا

اس کے علاوہ

ہی از اے نوباڑی

سیانے کہتے ہیں ہر فرد کے وجود سے شعائیں نکلتی ہیں جن کے رنگ اس فرد کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں شخصیت کی اس دھنک کو "اورا" کہتے ہیں جسے دیکھنے یا محسوس کرنے کے لئے ایک خاص حس درکار ہوتی ہے میں اس حس سے محروم ہوں لیکن اس نوباڑی کا "اورا" اس قدر پراثر تھا کہ مجھے بھگو کر رکھ دیا

اس کے بعد کئی ایک دن اسکا خیال مجھے "ہانٹ" کرتا رہا جی چاہتا تھا پھر اس سے ملوں

میں نے ڈاکٹر شمشاد سے پوچھا

ڈاکٹر شمشاد ہارون پارا سائیکالوجی میں خصوصی ٹریننگ حاصل کرکے آئی تھیں

میں نے پوچھا ڈاکٹر "اورا" کو دیکھنے کی حس کیسے حاصل کی جاتی ہے وہ ہنسی کہنے لگی مفتی جی اب تو ایسی مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں جو "اورا" کو ریکارڈ کر لیتی ہیں اور معالج "اورا" کو دیکھ کر مرض کی تشخیص کرتا ہے میں خود کراچی میں ایک ایسا معمل کھولنے والی ہوں

میں نے پوچھا آپ نے ٹریننگ کہاں کی ہے

بولی امریکہ میں

امریکہ میں' میں نے پوچھا

ہاں امریکہ میں وہاں 80 فی صد لوگ بھرپور دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں اور 20 فیصد تحقیق کے کام میں خود کو بھولے بیٹھے ہیں۔ لباس کا ہوش نہیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں۔ نام و نمود کی چاہ نہیں اپنا خود کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ بس سر پر ایک دھن سوار ہے کہ قدرت کے بھید کو جانیں۔ سمجھیں۔ مفتی جی ولی اللہ اور کسے کہتے ہیں ولی اللہ وہی ہوتا ہے نا جو اللہ کی کائنات کو سمجھنے میں خود کو بھلائے بیٹھا ہو۔

اسکے بعد دو ایک بار وہ مجھے ادبی محفلوں میں نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک عام آدمی ہے۔ خود کو دوسروں سے کم تر سمجھتا ہے۔ ایک کامی حکم ماننے والا۔ خدمت پر کمربستہ۔ مٹی کا ایک میلا کچیلا دیا جو مدہم لو سے جل رہا ہے۔

میں نے کسی سے پوچھا یہ کون ہے کہاں کا ہے۔

تم اسے نہیں جانتے کیا اس نے جواب دیا یہ رشید نثار ہے۔ پوٹھوہار کا اعوان ہے۔

نہیں یہ پوٹھوہار کا نہیں ہو سکتا۔ پوٹھوہار کا تو جنگجو ہوتا ہے۔ خود دار ہوتا ہے۔ ذات کے مان سے بھرا ہوتا ہے نک چڑھا ہوتا ہے مچھ مروڑ ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہ ہو تو بھی خود کو سم باڑی سمجھتا ہے۔

پھر ایک ادبی محفل میں میں نے دیکھا کہ وہ روسٹرم پر کھڑا مقالہ پڑھ رہا ہے۔

میں حیران ہوا۔ ارے یہ کون بول رہا ہے اتنی پر شکوہ نثر اتنے فلسفیانہ

خیالات۔ تحلیل نفسی۔ تحقیق تنقید نہیں یہ وہ رشید نثار نہیں ہو سکتا جس پر میں تو کچھ ہی نہیں کی چھاپ لگی ہے۔ جو مٹی کے دیئے کی مدھم لو سے جلتا ہے۔

میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا یہ رشید نثار کتنا پڑھا لکھا ہے

وہ بولا۔ بی اے آنرز ہے۔ اردو انگریزی اور اسلامیات میں ایم اے ہے۔ شاعر ہے۔ صاحب طرز مقالہ نگار ہے۔

دکھتا تو میٹرک فیل ہے میں نے کہا۔

ہاں وہ بنا ایسے ہی دکھتا ہے۔ صرف دکھتا ہی نہیں ساری زندگی میٹرک فیل کی حیثیت سے گزاری ہے۔ ڈگریوں کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔

صاحبو میں نے زندگی میں تین نوبازی دیکھے ہیں۔

ایک قدرت اللہ شہاب تھا۔ لیکن وہ عام نوبازی نہیں تھا۔ پراسرار نوبازی تھا۔

وہ اونچے عہدے پر فائز تھا۔ دانش ور تھا۔ بیورو کریٹ تھا پتہ نہیں اسکے "اورا" میں عجز کی ٹوٹ اتنی پر اثر کیوں تھی۔ جب وہ تھری پیس سوٹ پہن کر ہارڈ کالر میں شوخ رنگ کی ٹائی لگا کر بٹن ہول میں سفید پھول سجا کر صدر مملکت کے جلسے میں خصوصی دروازے سے داخل ہوتا تو دروازے پر کھڑا انسپکٹر اسے روک لیتا۔ صاحب آپ ادھر عام دروازے سے داخل ہوں یہ خصوصی دروازہ ہے۔

جب وہ جلسہ گاہ میں ریزرو نشستوں پر بیٹھتا تو انٹیلی جنس کا کوئی افسر اسے اٹھا دیتا۔ جناب یہ نشستیں اہلکاروں کیلئے ہیں۔ آپ ادھر جنرل پبلک میں جا کر بیٹھیں۔

ایک دن میں نے قدرت سے پوچھا میں نے کہا یہ کیا اسرار ہے آپ بن ٹھن کر جاتے ہیں۔ لباس خصوصی ہوتا ہے انداز خصوصی ہوتا ہے لیکن خصوصی دراوزے پر کھڑا انسپکٹر آپ کو روک لیتا ہے۔ وہ آپ کو عمومی کیوں سمجھتا ہے۔ کیا اس لئے کہ آپ کے "اورا" پر عمومی چھاپ لگی ہوتی ہے۔

وہ گھبرا گیا کہنے لگا میں خود حیران ہوں۔ کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ حالانکہ میں خصوصی بننے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔

تیسرا نوبازی غلام احمد تھا۔

وہ ستار بجایا کرتا تھا۔ حالانکہ ستار ایک طربیہ ساز ہے لیکن غلام محمد کی ستاریوں بجتی تھی جیسے سارنگی ہو وہ بجتی نہیں تھی روتی تھی۔ دکھ تھا درد تھا التجا تھی۔ وہ منتیں کرتی تھی۔ ترلے لیتی تھی۔

میں اس سے پوچھتا غلام محمد لوگ نماز پڑھ کر دعا مانگتے ہیں تو ستار بجا! ہے یہ کیا بات ہوئی۔

وہ جواب دیتا میں بھی تو دعا ہی مانگتا ہوں۔ یہ مجھ سے بہتر دعا مانگتی ہے رو رو کر ترلے لیتی ہے منتیں کرتی ہے دکھ درد کی کتھا سناتی ہے

میں نے پوچھا غلام محمد تو نے یہ دکھ کہاں سے پایا۔

بولا بڑی بھاری قیمت دے کر پایا ہے۔ میں نے سب کچھ دے دیا جو میرے پاس تھا سب کچھ۔ کیا تھا میرے پاس

میرے پاس آنکھیں تھیں جن میں پھلجھڑیاں چلتی تھیں۔ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتا وہ میری ہو جاتی۔ میرے گرد پروانوں کی اک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میری صرف ایک خواہش تھی کہ ستار بجاؤں۔ لیکن وہ بجتی نہ تھی۔

پھر بابا جی آگئے۔ میں نے کہا بابا دعا کرو کہ میری ستار بجے

بابا مسکرایا بولا پتر اندر درد نہیں تو ستار کیسے بجے۔

بابا نے میری آنکھوں کو کالے چشموں سے ڈھانپ دیا۔ حکم دیا کہ خبردار آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر میری ستار بجنے لگی۔ ایسی ہی ایسی بجی کہ جب دعا مانگتی ہے تو وہ خود نیچے اتر کر میرے روبرو آکر بیٹھ جاتا ہے۔

رشید نثار بھی بھرپور نگاہ سے دیکھتا ہے تو لگتا ہے کبھی پھول انگارے جھڑتے تھے اب عدم استعمال سے زنگ آلود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کنہیا کے گرد بھی کبھی گوپیوں کا جھرمٹ لگا رہتا تھا۔ لیکن اسکے خون میں یہ خوف رچا بسا رہا کہ کچھ بن نہ جاؤں گمان غالب ہے کہ اس نے آنکھیں موند لیں۔ پھر بھی ایک ہندو دیوی نے اسے نثار کا لقب بخش دیا اور وہ عبدالرشید سے رشید نثار بن گیا۔ پتہ نہیں وہ دیوی خود نثار تھی یا چاہتی تھی کہ رشید نثار ہو جائے

رشید کی زندگی کا بیشتر المیہ اسکی Jeans کی وجہ سے ہے اسکی Jeans نے اس پر اتنی پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ خود مختاری محض اک تہمت رہ گئی ہے۔

وہ ازلی طور پر ایک کامی ہے' خدمتی ہے' خاکسار ہے عقیدتی ہے۔ صرف صوفی منش ہی نہیں ساتھ ملامتیہ بھی ہے۔

صاحبو میں تصوف کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ جاننے کی کوشش کی تو کتابوں نے مجھے مزید کنفیوز کر دیا۔ کتابوں میں یہ عیب ہے کہ وہ راستہ نہیں دکھاتیں بلکہ چوراہے پر لا کر چھوڑ جاتی ہیں۔

میں نے بڑے صوفیوں کے تذکرے پڑھے ان میں پیر مرشد تھے سرکار قبلہ تھے صاحب کشف و کرامات تھے۔ لیکن ان کے اندر کے عظیم انسان کا

ذکر نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم ان سے عقیدت پیدا کر سکتے ہیں ان سے محبت کے جذبے سے محروم رہتے ہیں۔

میری دانست میں صوفی ایک رویہ ہے ایک رخ ہے وہ یہ کہ جو ہے۔ جیسا کیسا بھی ہے خوب ہے۔ جو نہیں ہے اس کا غم نہیں۔ بلکہ جو نہیں ہے وہ بھی خوب ہے کہ نہیں ہے اتنی سی بات انسان کو کیا مقام عطا کر دیتی ہے

صوفی منش لوگ صوفیا کی طرح عظمت کے مینار نہیں بنتے وہ انسانوں سے الگ نہیں ہوتے بلکہ صوفیا کی طرح ان میں گھلے ملے رہتے ہیں۔ رشید نثار کے یہ تمام اوصاف توارثی تھے خدمت اور عقیدت کی بیماری خاندانی تھی

رشید کا دادا میاں فضل احمدؒ کلیام اعوان کے بزرگ کا پگڑی بدل بھائی تھا۔ باپ میاں فضل کے مرید سائیں سنگھوری والے کی چوکھٹ کا چلہ کش تھا۔ بچپن ہی میں رشید کو بری امام کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس پر عاید تھا کہ خدمتی کای بن کر زندگی گزارنی ہے اسی وجہ سے رشید نثار نے اتنی ساری ڈگریوں کے ہوتے ہوئے اپنے کیریر کا آغاز اخبار نویسی سے کیا۔

پھر قائداعظم سے عقیدت ہو گئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ نیشنٹ اخبار چھوڑ کر مسلم اخبار میں کام کرو۔ دیر تک مسلم لیگ کا ورکر بنا رہا۔

رشید ایک انوکھا سیاسی ورکر تھا۔ کچھ کرنا تھا۔ کچھ بننا نہیں تھا۔ اس لئے عمر بھر سیاسی کارکن رہنے کے باوجود کچھ بن نہ سکا پھر اسے خیال آیا کہ معاشی خدمت سیاسی خدمت سے بہتر ہے بچپن ہی میں وہ محلے کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے حفظان صحت کا درس دیا کرتا تھا۔ بچوں سے ورزش کراتا۔ کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو دوا دارو کی تمام تر ذمہ داری رشید پر ہوتی تھی۔ بہتر خدمت کے جذبے کی وجہ سے وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔

ان دنوں خاکساروں کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ رشید نے کالج میں خاکسار سپرٹ کو اس شدت سے پھیلایا کہ ضعفر حیات کے حکم سے کالج سے نکال دیا گیا اور کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔

پھر وہ جی ایچ کیو میں کلرک بن گیا۔ کچھ دیر پنڈی رہا پھر کوئٹہ تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں کئی ایک سال روزنامہ اتحاد ایڈٹ کرتا رہا۔

کوئٹے میں محشر رسول نگری سے عقیدت لگا بیٹھا۔ تیرہ سال اسکے قدموں میں بیٹھا رہا۔

محشر رسول نگری ایک انوکھا بزرگ تھا۔ ریڈیو پاکستان کے بیشتر لوگ اسکے معتقد تھے۔

محشر پہلی مرتبہ مجھ سے ملا تو کہنے لگا مجھ سے ملو میں نے ان سے پوچھا کون کہنے لگا میں اصل ہوں تم نقل ہو۔ میرا نام محشر رسول نگری ہے

میں نے کہا جا بھائی جا۔ تو بزرگ ہے۔ میں نہ تو بزرگ ہوں نہ مجھے خود بزرگ بننے کی یا کسی بزرگ سے ملنے کی طلب ہے نہ میرا کسی بزرگ سے تعلق ہے۔

اس نے گھور کر مجھے دیکھا بولا آپ سے کس نے کہا کہ میں بزرگ ہوں یا میرا بزرگوں سے کوئی تعلق ہے

سبھی کہتے ہیں میں نے جواب دیا

اور آپ مان لیتے ہیں۔ مطلق آپ بڑے احمق ہیں

وہ تو میں ہوں میں نے کہا

میں بھی ہوں وہ مسکرایا۔ دیکھو وہ بولا تم بھی ایک انسان کے مارے ہوئے ہو میں بھی ایک انسان کا مارا ہوا ہوں جس کا میں مارا ہوا ہوں وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔ مریض ڈاکٹروں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ وہ مریضوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اسکا مسلک خدمت تھا بے غرض خدمت۔

تم نے اپنی کتاب لبیک میں لکھا ہے۔ کاش کہ میں کسی ندی کو راہ پر بناتا۔ مجھے یہ تو پتہ چلتا کہ وہ کدھر سے آتی ہے کدھر کو جاتی ہے۔ اسکی منزل کیا ہے لیکن میں نے سمندر کو راہ بر بنا لیا نہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کدھر سے آتا ہے نہ پتہ چلتا ہے کہ کدھر کو جاتا ہے وسعت ہی وسعت بے کراں وسعت تم نے لکھا تھا نا وہ بولا

ہاں لکھا تھا میں نے کہا

وہ بولا بس یہی غلطی میں نے کی۔ اب میں بے کراں وسعت میں آوارہ ہوں۔

پتہ نہیں رشید نثار نے محشر میں کیا دیکھا۔ 13 سال اسکی جوتیوں میں پڑا رہا۔

پھر اسے پنڈی جی ایچ کیو میں تبدیل کر دیا گیا

جی ایچ کیو والے رول قانون کے دیوانے ہوتے ہیں وہ بیچارے سخت پریشان تھے کہ یہ رشید نثار کیا چیز ہے جو اتنی ڈگریاں ہوتے ہوئے بھی کلرکی کر رہا ہے انہوں نے سوچ سوچ کر اسے نیشنل ڈیفنس اکادمی میں بھیج دیا۔

رشید نثار اپنی ڈیوٹی تو سرانجام دیتا رہا لیکن خدمتی کای جذبے کی تسکین کے لئے ساتھ سیاسی ورکر کا کام بھی شدومد سے کرتا رہا۔

جی ایچ کیو نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو ایسے نہیں چلے گا ہم فوجی لوگ ہیں فوجی سیاسی نہیں ہوتے۔ تم یا تو نوکری کرو یا سیاسی کام کرو۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے سوچ لو کہ کیا کرنا چاہتے ہو۔

رشید نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔

پھر وہ دہاڑی دار بن گیا۔ آج تک دہاڑی دار ہے۔ جو کام ملا کر لیا۔ جتنے پیسے ملے بیوی کی جھولی میں ڈال دیئے۔

حیرت کی بات ہے کہ بیوی اس کی ساتھی ہے عام طور پر ایسے شخص کو ایسی بیوی عطا ہوتی ہے جو راستے کی رکاوٹ ہو۔ اللہ کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے۔

مل جاتا ہے تو پیٹ بھر کر کھاتے ہیں نہیں ملتا تو گزارہ کر لیتے ہیں۔ جیسے کیسے بھی ممکن ہو جو ہے خوب ہے۔

رشید نثار علامہ مشرقی کا پرستار ہے کہتا ہے علامہ ایک بھرپور انسان ہے۔ سائنس دان ہے عالم ہے فلسفی ہے۔ مسلمان ہے مجاہد ہے سوشل ورکر ہے اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم آرگنائزر ہے جس نے خاکسار تحریک کو چلایا یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کی روئے زمین پر مثال نہیں ملتی رشید نثار نے علامہ پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ ایک سال سے وہ کتاب تشنہ طباعت پڑی ہے خود چھپوانے کی توفیق نہیں۔ پبلشر کام نہیں جانتے۔ وہ نام پوچھتے ہیں مقام پوچھتے ہیں۔ رشید کے پاس صرف کام ہے نہ نام ہے نہ مقام وہ ایک خدمتی ہے کامی ہے زندگی میں اسکی کوئی منزل نہیں صرف سفر ہی سفر ہے جو میسر ہے خوب ہے جو نہیں ہے خوب ہے کہ نہیں ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ اعتراف کرلینے دیجئے کہ کرسی صدارت کیلئے میرا انتخاب درست نہ تھا۔ یہاں کوئی ایسا شخص درکار تھا جو مفتی جی کی ۔د آور شخصیت کے گرد چوکھٹا لگا کر اسے سجانے کا اہل ہوتا لیکن محبت میں ۔وماً فیصلے غلط ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے افتخار عارف اور مفتی جی کے سامنے ۔ر جھکانا پڑا۔ویسے بھی افتخار کی محبت بھری شخصیت ایسی ہے کہ اس کے ۔امنے چھوٹے کو بڑا دن کو رات کالے کو سفید کہنے سے انسان اپنا ہی اعزاز ۔سوس کرتا ہے۔ آج شام بڑے جبر سے مجھے اس کرسی پر بیٹھنا پڑا جو میرے ۔لئے بڑی تھی اور جس پر بیٹھ کر میرے پاؤں فرش تک نہیں پہنچتے تھے

مفتی جی پر جو کچھ بھی لکھا اور پڑھا گیا میری دسترس سے بالکل باہر ہے ۔لین اتنا میں وثوق سے کہوں گی کہ مفتی جی پر جس قدر کام ہونا چاہیے تھا ۔قسمتی سے ہمارے گرم ملک کے لوگوں سے وہ نہیں ہوسکا۔ نہ تو تنقید کے ۔لسلے میں وہ ٹھوس مضامین وجود میں آئے جو مفتی جی کے پودے کو درخت ۔نا دکھاتے۔ نہ ہی ایسی محفلیں مجلس شامیں تواتر سے منائی گئیں جن کی اشد ۔ضرورت تھی۔ میری آرزو ہے کہ ناقدین کی اور توجہ ان کی تخلیقات پر ہو ۔ر وہ ان کے ادبی سفر کو اور گہری نظر سے پرکھیں' جانچیں اور اس کے صحیح ۔را سیکیٹو میں پیش کریں۔ مشکل یہ ہے کہ عہد ابلاغ کا ہے ناقدین کسی ایک ۔دیب پر پوری تفصیل کے ساتھ سیر حاصل کام نہیں کرتے۔ بلکہ تازہ بتازہ ۔روں کی طرح چلتے پھرتے کیمروں کی مانند 'ادب' کی جھلکیں پیش کرتے رہتے ۔ں جن سے کسی ایک ادیب کے متعلق مکمل رائے قائم کرنا ممکن نہیں ۔وتا۔

۔فتی جی پر کچھ کہنے سے پہلے آپ کی اجازت سے میں رابرٹ فراسٹ کی نظم ۔یسٹ رننگ بروک کا ابتدائیہ پڑھ دوں.....

۔شمال کہاں ہے فرد"
۔ری جان شمال وہاں ہے
۔ی مغرب کو چلتی ہے
۔چھا تو پھر تم اسے پچھمی ندی کہو ناں

جبکہ باقی تمام ندی والے سمندر کی طرف جانے کیلئے مشرق کی طرف جاری ہیں

لگتا ہے ندی کو پورا یقین ہے کو وہ تضادات میں سے ہو کر سمندر تک پہنچ جائے گی

مفتی جی پچھمی ندی ہیں وہ اندر باہر تضاد میں گھرے تضاد میں سوچتے ہوئے' تضاد میں زندہ ایک جڑی زندگی اور زندگی سے بھی بڑا ادب پیدا کررہے ہیں۔ انہیں میٹھے کے ساتھ نمک کھانے کا ڈھب آگیا ہے۔ دن کی روشنی میں بتی جلا کر لکھ سکتے ہیں۔وفا کے ہمراہ بے وفائی کرنے کے اہل ہیں۔ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست کے روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ سچ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی جھوٹ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بدکتے نہیں ہیں۔ آنسوؤں کے پیچھے مسکراتے رہنا اور مسکرانے کے باوصف شدید غم کو بالک کی طرح گود میں لئے رہنا ان کیلئے آسان ہے وہ منٹو اور عصمت سے اس لئے آگے ہیں کہ وہ تضاد کا شکار ہیں اور تضاد کو انہوں نے شکار پر بھی رکھا ہے ساری عمر انہوں نے جنس کی کمائی کی اور اس میں کرب انہیں نے اس تی کا سمویا جو سوائے تیاگ کے اور کچھ نہیں جانتا انہیں ساری عمر حیات افزا وصال کی تلاش تھی لیکن لذت زیست انہیں فراق میں نصیب ہوئی

سطح آب پر ہوائے کی طرح تیرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ لیکن ڈوب جانے میں انہیں اپنی ذات کی معراج نظر آتی ہے ایک ہی واقع سے ایک ہی وقت میں دو معنی خیز نتائج نکال لیتے ہیں۔ جن کا آپس میں کوئی حل نہیں ہوتا۔ ایک ہی شخص سے بیک وقت محبت اور نفرت کئے جانا ان کا شعار ہے۔ وہ مشہور ہو کر گمنامی کے صحرا میں بھٹکنا چاہتے ہیں۔ اور گمنام رہ کر ان کی آرزو اتنی رہتی ہے کہ قریہ قریہ بستی بستی ان کے نام کا سمرن جاری رہے۔ شیشے کی طرح اندرونی اور بیرونی دباؤ سے ٹوٹتے نہیں بلکہ نرم لچکیلی شاخوں کی طرح دباؤ کو چڑیا کی طرح جھلاتے رہتے ہیں۔ مفتی جی بڑے' آدمیوں کی تعریف تو کرسکتے ہیں۔ لیکن تعریف سے آپ یہ معنی نہ لیجئے گا کہ وہ کسی بڑے آدمی سے محبت بھی کررہے ہیں۔

پنجرے کی زندگی راس آئی جہاں جذبے اور دانش کو جڑواں بچوں کی طرح انہوں نے ایک کا چہرہ مغرب اور ایک کو مشرق کی کروٹ سلا دیا اور خود ہمیشہ شمال کی جانب دیکھتے رہے۔ جہاں قطبی ستارہ چمکتا ہے جو ہر مسافر کی سمت درست کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آپ سب کی توقع ہوگی کہ میں بات مختصر کروں لیکن چونکہ میں لاہور سے آئی ہوں آپ تھوڑی دیر کیلئے میری باتوں کو برداشت کر لیجئے اور ان فرسودہ باتوں کو رحم دلی سے سن لیجئے۔

ہم سب غالباً ایک ہی مٹی سے بنے ہیں لیکن جس طرح حکیم لوگ نسخے میں چند اجزاء بڑھا گھٹا کر کبھی زکام اور کبھی معدے کا علاج کرتے ہیں ایسے ہی اوپر والے کے پاس ہر انسان کی مٹی گوندھنے کیلئے پانی عرق مائع مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کی مٹی کھاری پانی سے گوندھی جاتی ہے کچھ سارے کے سارے عطر میں گوندھے جاتے ہیں کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں برفیلے پانی نصیب ہوئے۔ کچھ انسون جل سے بھگو بھگو کر بنائے گئے کہ ساری عمر سوگواری کے پیچھے دوڑتے گزری۔ کچھ کو جوہڑ کا پانی نصیب ہوا۔ اور ان ہی پانیوں سے متعفن رہے۔ ایسے بھی تھے جنہیں پانی تو ملا پر ترس ترس کر ساری عمر ریت کے گھروندوں کی طرح بھر بھرے رہے لیکن خال خال دیر دیر کے بڑے انتظاروں میں رکھ کر---- بڑی سوچ کے بعد اللہ میاں پریم جل سے کچھ مٹی کے پتلے بناتا ہے۔ شاید اللہ میاں کی گڑوی چھوٹی ہے شاید فرشتوں کو پریم جل مشکل سے ملتا ہے۔ لیکن جن کو اس جل سے گوندھا جاتا ہے وہ سورتی سہان ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ مفتی جی کو بھی بنانے والے نے اسی امرت سے گوندھا ہے۔

مفتی جی کسی وجہ، کسی مقصد، کچھ سوچ کر لوگوں کے قریب نہیں جاتے بلکہ یونہی چلتے چلاتے بولتے بلاتے ہنستے ہنساتے لوگوں کے ساتھ پروئے جاتے ہیں۔ مفتی جی خواہ مخواہ ہومیو ڈاکٹری کرتے ہیں۔

لوگوں کو پریم پتر لکھتے ہیں۔ تعریف کر کے ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور احساس کمتری کے زخم دھوتے ہیں۔ مفتی جی اگر حلقہ گوش کے دکھ سکھ میں شریک نہ بھی ہوں کسی کو دیکھ کر دیوار کی جانب منہ بھی کر لیں تو بھی لوگ ان کے گرد آئیں گے کیونکہ ان کی مٹی پریم جل سے گندھی ہے۔ آج کا مادی دور سفاک سہی ہمیں اشیاء کی محبت نے پھونک بھی ڈالا ہو۔ ہم سٹیٹس کے شوق میں دور ہی جا چکے سہی لیکن پریم کی بنسری ہم پہ جادو کرتی ہے۔ ہم غزالی آنکھوں کی ان کہی توجہ سے چھوٹ نہیں سکتے۔

ہاتھوں کا گرم لمس ہمیں آج کے دور میں تا دیر یاد رہتا ہے۔ پھر ہم مفتی جی کو کیسے بھول پائیں گے جن کی تاثیر بھی محبت، ردعمل بھی پیار اور خوراک بھی شفقت کی چمچی میں ملتی ہو---- بھلا ایسی تریاق پڑیا کے ہوتے ہوئے کسی اور ٹانک کی ضرورت رہتی ہے---؟ اسلام آباد والے خوش نصیب ہیں کہ ان کے پاس ہومیو پیتھی کی پڑیاں دینے والا ہی موجود نہیں بلکہ مجسم پریم مورتی ہے--- یہ ایک اور کہانی ہے کہ پریم مورتی کے سامنے ایک سانپ مفتی جی نے سدھار رکھا ہے جو لہرا لہرا کر اپنی ہی مٹی کی بد تعریفی کرتا رہتا ہے۔

لیکن میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مفتی جی تضاد سے محبت کرنے والے پیچھی ندی ہیں ندی کا تو کام ہی یہی ہے کبھی کبھی سیلاب میں آکر کنارے ڈبو ہی دیا کرتی ہے۔

چالیس برس گزرتے ہیں ایک تنقیدی نشست رہی ہوگی جب میں نے ممتاز مفتی کو پہلے پہل دیکھا وہ گلوری بائیں کلے میں دبائے ہونٹوں پر ہلکا سا لکھوٹا پان کا جمائے خاموش بیٹھا تھا۔

پھر اسے افسانے پڑھتے ہوئے سنا۔ اس کے جملوں کا دروبست۔ لہجے کے بودوہست۔ اناث و ذکور کے کردار و گفتار کے نفسیاتی تجزیے کا انداز سامعہ نواز پایا۔

وہ خلوتوں کی دلچسپیوں میں گم افراد کی حرکات کا ماہر عکاس ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک داستان گو ہے۔ اس کے ہلکے پھلکے انشایئے افسانے اور بیانئے آس پاس بکھری ہوئی کہانیوں کے لکھے ہیں۔ وہ قاری کو چونکا دینے کا فن خوب جانتا ہے وہ زندگی بھر معاشرے میں در بدر بھٹکنے والوں کا مشاہدہ کرتا رہا اور ساتھ ساتھ ابن آدم کے گندم کی بھوسی کو چھانتا اور پھٹکتا بھی رہا۔

میں بہت دنوں اس سے خوفزدہ رہا اور اسے دیکھ کر حفظ بلیات کا وظیفہ پڑھا کرتا۔ مگر تابہ کے ایک روز سرسری سا تعارف ہوا۔ ہوتے ہوتے تعلقات بڑھ گئے۔ پھر اندھا دھند دوستی ہوگئی جس کی حفاظت ہمیں ہتھیلی کے چھالے کی طرح کرنی پڑی۔

ان دنوں یہاں ایک روحانی حلقہ تھا۔ جہاں چند دوست لذت گفتار کی خاطر اور کچھ روح کی طلب و تشنگی کی تسکین کے لئے مل بیٹھتے۔ میں بھی ان کا شریک سفر تھا۔ محض یہ جان کر کہ اصحاب کہف کے پیچھے پیچھے ایک کتا بھی چلا گیا تھا۔ کتاب حکمت و آگاہی میں اس کا ذکر ہے اور جنت میں مقام بھی موجود ہے۔ میں نے ایک روز ممتاز مفتی سے کہا۔

یہ دل آخر ہجوم آرزو ہے تم بھی آجاؤ
ہم اس کو زندگی کی آخری محفل سمجھتے ہیں

اور بقائمی ہوش و حواس وہ اس حلقے میں در آیا۔ لیکن مجھے جلد ہی محسوس ہوگیا کہ عقیدے کی گرمی نے اس کے ظاہری افکار کو باطن سے الگ کر رکھا ہے۔ اس کے محیط کی سطح ساکن اور تہ میں ہیجانی کشمکش بپا

آخر ایک روز پتہ چلا کہ اس کے خاندان میں یہ مرض موروثی ہ
اس کے نانا مرحوم سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت سید غوث علی شاہ پان
پتیؒ کے متوسلین میں سے تھے۔ اور انہوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات
ایک ضخیم مجموعہ مرتب کر کے چھپوایا بھی تھا۔ یہ نایاب تذکرہ میں نے
ممتاز مفتی سے لے کر مطالعہ کیا اور جانا کہ نواسے میں اپنے نانا کی نسبت
ارادت کا وجدانی اثر موجود ہے اور

واقعہ یہ ہے کہ نسبت کام دیتی ہے ضرور
روح تشنہ تھی در پیر مغاں تک آگئی

مفتی کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف ہے۔ وہ ردائے ابر کی اوٹ
میں بیٹھ کر زمانے کی نگاہوں سے چھپ چھپ کر بادہ حجاز کے گھونٹ لی
اور کسی چاہت میں چلتا رہا ہے خانقاہوں کی بیٹھک اور مزاروں کا پھیر
اس کی روح کے طبعی تقاضے تھے جن کا محدود حلقہ یاراں کے سوا کسی
علم نہیں۔ لیکن خود اس کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ آتش کی کشید جب سر
چڑھتی ہے تو پھر کوئی ترشی اسے اتار نہیں سکتی۔ جرعہ جرعہ چڑھاؤ تو کیف
شبانہ دریا دریا امڈ آتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بے قابو حواس کی یہ داستان
اس کی شاہکار تصنیف "لبیک" کے صفحات پر بکھری ہوئی ہے۔

اس سے پہلے وہ کمال چابک دستی سے جنسی ماحول کی تصویر کش
کرتا رہا۔ پھر علی پور کا ایلی میں جنس کے ساتھ معاشرت کے رنگا رنگ
مسائل کی نشان دہی کی اور ایسے کردار تلاش کئے جن کے عمل اور نیت
میں مضحکہ خیز حد تک تضاد ہوتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کے بعد اردو اد
میں ممتاز مفتی ہی وہ تنہا قلمکار ہے جس نے بدلتے ہوئے دور کا جدی
افسانہ آزاد تخلیق کیا ہے اس نے مدتوں آپاؤں اور اماراؤں کو اپ
سخن کا پردہ ابر ڈھال بنائے رکھا۔ تاکہ لوگوں کو اس کے مخفی مسلک
پتہ نہ چلے۔ لیکن ایک روز "آپاؤں نے تنگ آکر اندر والے مفتی سے
کہا۔

"پیارے یا تو گوکل کے بن میں مرلی کی رسیلی
تان آڑا اور رادھا جی کا گردھاری بن کر

بھیری کے مدھر راگ میں پریت
ریت کے سنگیت کی کوئی ٹیت لے چھیڑ
اوڑالنڑ گوپیوں کا سندر کنہیا بن جا کہ
بھیا اساڑھ سے کی کڑی دھوپ میں دو روپ
ایک ساتھ نہ چل سکیں گے"۔

مفتی نے سوچا پیشانی کی لکھت نے کہاں لا کے مارا۔ سلمٰی سے دل لگا کے بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہوں ۔چنانچہ اس نے دھیرے دھیرے پردہ سرکانا شروع کیا اور آخر کار لبیک کے شائع ہوتے ہی یک بارگی بم پھٹ گیا۔ تاشقند کے ایک ادبی سیمینار تک میں ہا ہا کار مچ گئی کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ماجرا بپا ہوا۔ مگر "لبیک" کی تصنیف ایک حادثے سے بیش نہیں اس مرتبہ اندر کے مفتی کو چھپانے کے لئے باہر کا مفتی کوئی فن کارانہ تجلی نہ دکھا سکا۔ نقاب اتر گیا۔ اب آنکھوں والا ترے جوبن کا تماشہ دیکھے۔ لبیک ہی کے جھروکے سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی نفسیات اور افراد کی نیتوں اور عمل کے تضاد کا مکمل شعور رکھنے والا علی پور کے ایلی کا مصنف کہ نام جس کا ممتاز مفتی ہے اپنی عقل و خرد کو روایت کے پشتارے میں باندھ کر مطاف میں پھیرے پہ پھیرے لگا رہا ہے اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑتا پھرتا ہے۔

پھر وہ بطحا سے یثرب کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ اس چوکھٹ کو چومنے کے لئے جہاں ہر سحر نسیم جاں فزا پھولوں کی مہک نچھاور کرنے آتی ہے۔ جبریل امین عرش اعظم سے صلوات و سلام کا پیامی بن کر اترتا ہے۔ وہ جس کی محفل میں فصل اور فاصلے قربت اور وصل میں بدل جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ سبز گنبد ہی وہ منزل ہے جسے کشتگان درد فراق اور راہ اشتیاق کے تمام راہی آخری حد مانتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر سفر تمام ہو جاتا ہے اور جو کم نصیب اس سے آگے کسی منزل کا تصور رکھتا ہے وہ دائرہ ایمان سے یوں نکل جاتا ہے جیسے تیر کمان سے چھوٹتا ہے یا انجمنستان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر اتھاہ اندھیاروں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ممتاز مفتی کے قلمی سفر کا تعلق ہے اس کی ایک اور داستان پاستان "الکھ نگری" کے نام سے طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔ اس میں اس نے اپنے مخفی مسلک کی کہانی بھرپور انداز میں بیان کی ہے۔

اس کا بچپن پریشان اور شباب کا زمانہ معاشی اضطراب کے کارن نا آسودہ رہا ہے اگرچہ

در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ

اوائل شباب میں وہ مدرس رہا۔ یوں تدریسی عمل کی جھلک بھی اس کے یہاں ملتی ہے کبھی کبھی وہ اپنے منفرد اسلوب کے پیچ و خم میں ہومیو پیتھی کی ہائی پوٹینسی بھی نکرا دیتا ہے کچھ اس میں خلقی رندی و سرمستی کے علاوہ خانقاہی چھاپ بھی موجود ہے ۔ نہ جانے اس نے زمانے میں کس کس سے خانے کی سیر دیکھی ہے۔ وہ دمڑی شاہ کی درگاہ سے لے کر بستی نظام الدینؒ تک ہر آستانے پر گھوما ہے۔ وہ اپنے مشاہدات میں حسب ضرورت بیلا مول اور تیزپات کی بھی چٹکی لگا کر اپنا مسالہ تیار کرتا ہے۔

وہ لکھتا نہیں طلسم باندھتا ہے۔ اور پوری قوت اور مقناطیسی جذب کے ساتھ سامع یا قاری کو اپنی جادوگری میں کھینچ لیتا ہے۔ وہ برگ حنا کی رگوں میں اتر کر پہلے اس کا رنگ نچوڑتا ہے اور پھر حسینہ ادب کی لوح جبین پر بندی لگا دیتا ہے۔

آج مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں ان دنوں الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھا۔ برابر کے کمروں میں کئی دوست براجمان تھے۔ ایک سے ایک لا ابالی' بے تکلف' ہلڑ باز۔ ہم لوگوں کے کمروں کی خصوصیت ان کی بے ترتیبی اور عادت کل وقتی دھما چوکڑی تھی۔ نہ معلوم کیوں اکثر رات کو گیارہ بارہ بجے چائے کی شدید خواہش ہوتی۔ لیکن کبھی شکر غائب کبھی دودھ عنقا۔ اکثر مانگ تانگ کر گزارہ کیا جاتا ------ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب بڑے نفت قسم کے مقیم تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ' نازک خدوخال' سنہرے فریم کی عینک' سلک کی شیروانی کمرہ پردوں اور صوفوں سے آراستہ اس میں ایک چھوٹا سا نعمت خانہ جس میں دودھ' شکر' چائے کے علاوہ اکثر کیک اور حلوہ بھی رکھا رہتا------ وہ اتنے لئے دیئے 'باتکلف' "آپ جناب" کرنے والے' نیچے سروں میں بولنے والے انسان تھے کہ مارے تکلف کے ہم کچھ نہ مانگ سکتے' پٹہ مار کر بیٹھ رہتے اور چائے کا معاملہ یہ رہتا کہ بس اچھی پی لی' خراب پی لی------ ایک دن یاروں نے طے کیا کہ یہ چند روزہ زندگی کب تک حسرتوں اور محرومیوں کا شکار رہے گی' رئیس زادے سے بے تکلفی کے تعلقات بڑھانے ضروری ہیں۔ ایک ماہر نفسیات دوست نے کہا کہ سب مراحل جتنی تیزی سے طے ہو جائیں اچھا ہے۔ "شاک ٹیکنک" استعمال کر کے دیکھو۔ یا تو دوستی ہو جائے گی یا سر پھٹول۔ چنانچہ ان کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون صاحب ہیں؟"

عرض کیا "ہم ہیں آپ کے پڑوسی"

بولے "تشریف لے آیئے' فرمایئے کیسے تکلیف فرمائی"

"بس جناب ملنے کو جی چاہتا تھا"

"خوب" --- وہ سنجیدگی سے بولے۔

"بھئی' 'خوب' کا کیا مطلب' تم تو بلاتے نہیں۔ سوچا ہم ہی مل آئیں" ہمارا ایک ترجمان بولا۔

وہ اس انداز گفتگو پر ذرا چونکے اور کہنے لگے۔ "آپ حضرات نے اچھا کیا جو تشریف لائے"

ہمارا دوسرا ترجمان گویا ہوا "اماں تشریف و شریف چھوڑو یار" ان کی بھنووں کا چلا چڑھا۔ آنکھوں کی گولیاں فائر ہوئیں منھ دہان توپ کی طرح کھلا۔ "بھائی صاحب عجب بے تکلفی ہے۔"

ہماری طرف سے آخری راؤنڈ فائر ہوا۔ "ابے یار چھوڑ اس تکلف کو۔ یہ بتا شکر دان میں شکر ہے یا نہیں۔ ایسی چائے پلوائیں گے استاد کہ یاد کرو گے۔

انھوں نے کچھ کہنے کو پہلو بدلا۔ ہم نے پیش بندی کے لئے بند باندھا۔ "پارٹنر بے تکلفی اس لئے ضروری ہے کہ تعلقات آج ہی استوار ہو جائیں۔ پھر ہم نے قہقہہ لگایا۔ فضا ایسی تھی کہ وہ بھی شامل ہو گئے۔ ذہین آدمی تھے۔ بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور پھر اپنے گروپ میں شامل ہو گئے۔ کلف اترا۔ آدمی بنے' زندہ دل شخص تھے اس کے بعد لطف سے کٹنے لگی۔

میں نے یہ واقعہ اسے لئے سنایا کہ ممتاز مفتی کے تعارف سے لے کر بے تکلفی تک کے مراحل بھی ایک ہی نشست میں طے ہو گئے۔ حالاں کہ نہ میں مقطع نہ وہ کلف دار بلکہ ان کے اندر جو بچہ چھپا بیٹھا ہے وہ خود ہی ہر وقت مچلنے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ میرا تعارف اسلام آباد کی ایک محفل میں ممتاز مفتی سے کرایا گیا تو ڈائیلاگ کچھ اس طرح چلا:

"مزاج شریف بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" مفتی جی بولے۔

"مجھے خوشی بھی ہوئی اور میری عزت افزائی بھی ہوئی" میں نے عرض کیا۔

"جی؟ واہ بھئی واہ"

دو چار منٹ بعد "تم آج کل کیا لکھ رہے ہو" استفسار ہوا

کوئی خاص چیز تو نہیں عرض کیا

غلط' بالکل غلط لکھے جاؤ' بس لکھے جاؤ' کچھ بھی سہی" وہ بولے

"مگر میں کون سا ادیب ہوں ---"

چھوڑ یار بس لکھتا رہ ---" پھر دو منٹ بعد "یار زمن تو یہ بتا کہ اب کب ملے گا؟ باتیں ہوں گی"

"جلد ملوں گا"

"واہ واہ۔ یہ ہوئی نا گل۔"

وہ دن اور آج کا دن ممتاز مفتی نے کبھی مجھ سے "آپ جناب" نہیں کہ۔ ہمیشہ تو اور کبھی کبھی تم کہہ کر مخاطب کیا۔ ان کا "تو" ہی ہماری دوستی کی بنیاد ہے اس لئے کہ ان کی تو تڑاخ میں اپنائیت کی شیرینی گھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیرے سے بھرا ہوا رس گلہ مفت کھا رہے ہیں۔ "آپ" کے بعد جب آدمی "تو" یا "تم" پر آجائے تو سمجھ لیجئے کہ تکلف کے پردے تہہ کر دیے گئے ہیں۔ کلف اتر گیا۔ گردن کی اکڑ ختم ہوگئی۔ اور اب آدمی' آدمی سے بات کر رہا ہے کسی وردی پوش سے نہیں مگر یہ "تو" اس قسم کی نہیں ہے جو گالی دینے' آستینیں چڑھانے یا ضرب خفیف و شدید پہنچانے کا دیباچہ ہوتا ہے۔ مفتی والی "تو" کا مطلب ہے کہ ۔

تو بیا بیا عراقی کہ زخا مگان مائی

اسلام آباد میں میرا قیام تقریباً ساڑھے تین سال رہا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اور ممتاز مفتی برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں مہینے میں ایک ملاقات تو لازمی تھی اس کے علاوہ بارہا مجھے ان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ جاڑوں میں کافی اور گرمی میں ٹھنڈی بوتل پلوانا تو خیر معمول تھا لیکن نزلہ زکام ہوا تو ہومیوپیتھک گولیاں بھی تواضع میں شامل تھیں مفتی جی کو ادب ' راگ ودیا' ہومیوپیتھی اور صوفیوں سے خصوصی دل چسپی ہے۔

قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مفتی جی سے میری ملاقات تو 1980ء میں ہوئی لیکن ملاقات کی بنیاد اسی دن پڑ چکی تھی جب نور الحسن جعفری سے زمانہ طالب علمی میں میری دوستی ہوئی۔ قصہ یہ ہے کہ نور الحسن جعفری پر نیلی چھتری والے نے مہربانی کی۔ ان کا چھپر پھاڑ کر ان کے آگے دولت کا ڈھیر لگا دیا۔ یعنی یہ الفاظ دیگر ادا بدایونی جم جم سے ان کے گھر آکر ان کی ادا جعفری اور میری بھاوج بنیں۔ حسن اتفاق سے ادا شاعرہ تھیں۔ اس کے کئی دور رس نتائج ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ادا کی معنی آفرینی کی روشنی میں ہمارا دوست نور علی نور ہوگیا۔ پبلک فنانس کے ریگ زار سے نکل کر شعر و ادب کے مرغزار میں چہل قدمی کرنے لگا۔ ادا نے اسلام آباد میں "سلسلہ" کا ڈول ڈالا جو ان کے اور ان کے میاں کے مخصوص ادب پرور دوستوں کا ایک نجی حلقہ تھا اور ممتاز مفتی اس سلسلے کی ایک کڑی قرار پائے۔ اگر نورل ' ادا جعفری کے میاں نہ ہوتے تو ان موصوف کو سلسلے کی ہوا بھی نہ لگتی اور اگر میری نور الحسن جعفری سے دوستی نہ ہوتی تو میں "سلسلہ" میں بار نہ پاتا۔ اور اگر سلسلہ نہ ہوتا تو ممتاز مفتی سے میری شاید کبھی ملاقات نہ ہوتی اور ہوتی بھی تو علیک سلیک کی حد سے آگے نہ بڑھتی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیے کہ ممتاز مفتی کے چاہنے والے ہزاروں ہوں گے۔ دوست اور شناسا بھی درجنوں ہوں گے اور جن سے دانت کاٹی روٹی ہے وہ بھی کئی "اوکھے لوگ" ہیں۔ اور یہی لوگ مفتی کے ماضی و حال سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور ان کی تصویر میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ میں تو صرف پنسل اسکیچ قسم کی چیز ہی پیش کر سکتا ہوں۔

مفتی جی سے ملاقات تو کل کی بات ہے مگر ان کے افسانے برسہا برس سے پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ برسوں گزرے جب وہ شعور لا شعور اور نفسیات کی لٹ سلجھا رہے تھے۔ ان کی تصویر کسی رسالے میں دیکھی تھی مجھے کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ ان کی اس پرانی تصویر میں' جب وہ خود نئے تھے ان کے گھنے' قدرے خم کھائے ہوئے بال جانب سماوات محو پرواز نظر آتے تھے۔ پھر جب اسلام آباد میں انھیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ماہ و سال کی گردش کے باوجود ان کے بالوں کی روئیدگی میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا صرف چاندی آگئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے بال تو سوئے فلک دیکھتے ہیں لیکن ان کا دماغ آسمان پر نہیں اور پاؤں تو ہر دم زمین پر رہتے ہیں ---------- سنا ہے کسی زمانے میں ممتاز مفتی بہت سوٹڈ بوٹڈ رہتے تھے لیکن اب مفتی اور تصنع چاندی اور بنالھتا ایک دوسرے کی ضد بن چکے ہیں۔ تصنع کے مختلف طریقے ہیں۔ بعض حضرات فیشن ایبل لباس' کف کار سے تصنع برتتے ہیں لیکن بعض گیروے اور میلے کپڑے منکوں کی تسبیح الجھے بالوں اور بے ہنگم داڑھیوں کو رعب جمانے کے لئے استعمال کرتے ہیں تاکہ پہنچے ہوئے بزرگ' عشق زدہ شاعر یا فنافی اللہ مجذوب سمجھے جائیں کبھی کبھی یہ بھی تصنع کے زمرے میں آتا ہے----- لیکن کچھ شریف آدمی ایسے بھی نظر آئے جو جبلاً اپنی ظاہری وضع قطع کی پرواہ نہیں کرتے اس میں ان کی کوئی منصوبہ بندی یا غرض شامل نہیں ہوتی - نہ ان کا مقصد اظہار مفلسی ہوتا ہے نہ ابلاغ اتقاو تقدس۔ اس کی عظیم مثال مولانا حسرت موہانی تھے جنھیں واقعی اپنی ظاہری ہیئت کذائی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ باطن ایسا روشن و تابناک تھا کہ انھیں ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی-----

ممتاز مفتی ہرگز حسرت موہانی نہیں لیکن لباس کی طرف سے ان کی بے

پروائی اسی قبیل کی ہے۔ انھیں بے پروائی، تساہل اور اپنے میں مگن رہنے کا شوق ہے۔----- یوں تو شلوار ہمارے ملک کا عام لباس ہے۔ لیکن جب یہ سرکاری یونیفارم بنایا گیا تو اس میں نئے تراش خراش، کڑھائی ترپائی، رنگ و روغن کی میچنگ، چمکیلے بٹن، واسکٹ اور دوسرے فیشن شروع ہوگئے اور سادگی بیچاری کفن لپیٹ کر لیٹ گئی۔ لیکن سب فیشن مفتی کے سر پر سے گزر گئے۔ انھیں ان باتوں کی کوئی پروا نہیں اپنے کام سے کام۔ کبھی سفید کرتے کے ساتھ کبھی شلوار پہنے چلے آرہے ہیں کبھی گیروے رنگ کی شلوار کے ساتھ نیلے پیلے کرتے پہنے بیٹھے ہیں۔

مجھے اسلام آباد میں "سلسلے" کی محفلیں یاد آرہی ہیں۔ کڑاکے کی سردی پڑرہی ہے بوندا باندی ہو رہی ہے۔ لوگ منتظر ہیں کہ مفتی جی ابھی تک نہیں آئے۔ اتنے میں موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ سنائی دیتی ہے۔ مفتی صاحب سر پر شاید لومڑی کی کھال کا کنٹوپ پہنے، ایک موٹا خرگوشیا کالروں کا سوئٹر چڑھائے اور ایسے رنگ کی شلوار پہنے نمودار ہوتے ہیں جس کا رنگ سیاہ کتھئی، سرمئی کچھ بھی ہو سکتا ہے یا شاید ان سب کا مرکب ہو۔ اگر کوئی کہتا۔

(مفتی جی، آپ فون کر دیتے۔ ہم موٹر پر آپ کو لے آتے۔ اتنی سردی میں آپ موٹر سائیکل پر کیوں آئے؟" مفتی جی پان کی پیک نگلتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔

"اوہ نہیں جی کوئی بات نہیں، بڑے آرام سے آگیا"

محفل سلسلہ "رن ڈش" پارٹی ہوتی تھی۔ مفتی جی کے ذمے ہمیشہ ایک ہی قسم کی "ڈش" ہوتی اور وہ تھی پانوں کی تھالی۔ وہ بلاناغہ پان لاتے اور محفل میں ان کی طرف سے صلائے عام تھی کہ ۔

دست نازک بڑھایئے صاحب پان حاضر ہے کھایئے صاحب

کھانے کے بعد مفتی کا پٹارہ کھلتا تو درجنوں کے حساب سے پانوں کے بیڑے برآمد ہوتے اور پھر دست نازک بھی بڑھتے اور غیر نازک بھی، صرف پٹارے کی طرف۔ کچھ بیڑے گلابی کاغذ میں لپٹے ہوتے کچھ سفید کاغذ میں۔ مفتی جی پرچہ ترکیب استعمال بیان فرماتے۔ "بھئی گلابی کاغذ میں سادہ پان ہیں اور سفید کاغذ میں مسالے دار۔ جو جس کو پسند آئے وہ کھائے"

مجھے معلوم نہیں کہ ممتاز مفتی کو پان کھانے کی عادت کب اور کیسے پڑی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ پان کو نہایت مرغوب غذا کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کبھی کسی نے "کل کے لئے" پان بنا کر دیے ہوں اور وہ "کل" انھیں آج تک بے کل کیے ہوئے ہو۔ ہمارے معاشرے میں پان کی اہمیت ظاہر ہے۔ ہمارے ادب میں پان کی سرخی نے بڑی رونقیں پیدا کی ہیں۔ ممتاز مفتی کی مسکراہٹ میں جو دل فریبی ہے اس میں بھی شاید پان کی جادو طرازی ہے اور کبھی کبھی یہ شک بھی گزرتا ہے کہ امرتسر کی گلیوں میں ممکن ہے انھیں دیکھ کر کسی نے یہ قطعہ بھی پڑھا ہو کہ۔

اس طرح بھر کے منہ، چبا کر پان غیر سے تو ہنسا نہ کر ہر آن
اس سے ہو گا ہمارے جی کا زیان اب بھی ظالم ہماری بات کو مان

مفتی جی کو ادب سے اوپری لگاؤ نہیں گہرا عشق ہے کہ یہی ان کی زندگی ہے۔ مگر وہ اس عشق کے معاملے میں وسیع القلب اور کھلے لٹ ہیں۔ بعض ادیب دوسروں اور خصوصاً نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی نہیں کرتے مگر ممتاز مفتی چاہتے ہیں کہ لوگ خوب لکھیں۔ وہ ہمیشہ یہی زور دیتے ہیں کہ لکھتے رہو "لکھتے رہو" نہ لکھے تو وہ کسی قدر آزردہ ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ محض ان کے اصرار کے باعث اسلام آباد میں کئی خواتین و حضرات نے مضامین اور ڈرامے لکھ ڈالے۔ اس عاجز سے بھی وہ اکثر تاکید سے کہا کرتے تھے۔ "اوئے زمن تو لکھتا کیوں نہیں؟" میں عذر کرتا کہ مفتی جی کیا لکھوں۔ میں عادی یہ پیشہ ور ادیب نہیں ہوں" خفا ہو جاتے اور کہتے "دیکھ یہ بہانہ بازیاں نہیں چلیں گی۔ تو کون ہے فیصلہ کرنے والا؟ تجھے حق کیا ہے؟ تو بس لکھتے جا" ان کے زور دینے سے میں بھی اکثر قرطاس و قلم سے الجھتا رہا اور جو کاتا وہ سلسلے کی محفل کی طرف لے دوڑا۔ سنتے تو خوش ہوتے۔

اس عاجز کے لئے ممتاز مفتی کی کرم فرمائیاں جو اسلام آباد میں شروع ہوئیں، میرے کراچی آنے کے بعد بھی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کا شکار نہیں ہوئیں۔ جب میں عازم کراچی ہوا تو پہلے تو انہوں نے اس احقر پر مضمون لکھا جو میرے لئے بہت بڑی عزت افزائی کا سبب تھا۔ پھر اپنی کتابیں جو پچھلے چند برسوں میں شائع ہوئیں مجھے بھجواتے رہے۔ ان کی جب کوئی کتاب آتی ہے تو ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرشتہ نہیں جو ماشاء اللہ زندگی کی 81 بہاریں دیکھ چکا ہے کس غضب کا آدمی ہے۔ یہ نہ سردی کو مانتا ہے نہ گرمی کو گرداتا ہے۔ بڑھاپے کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا ہے۔ آفت کا پیر جواں ہے۔ اس کے کچھ ساتھی تھکے تھکے لگتے ہیں، کچھ کھٹیا پر پڑے لحاف میں بیٹھے یا چپستاں بجھاتے ہوں گے۔ مگر یہ ہے کہ چشم بد دور لکھے جا رہا ہے اور زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

بوڑھا ہمیں نہ جانو اللہ کے کرم سے اب بھی ہمارے آگے یار و جوان کیا ہے۔

ممتاز مفتی کا خط یعنی "ہینڈ رائٹنگ" طرز بیان یعنی "اسٹائل" اور نثر کا اسلوب' پڑھنے کا انداز یعنی "ڈلیوری" تینوں میں امتیازی شان ہے۔ وہ صاف واضح اور خوب صورت حروف لکھتے ہیں۔ بڑے بڑے دائرے الگ الگ خوب جم کر لکھے ہوئے حروف کہ بچہ بھی پڑھ لے مگر عجیب بات ہے کہ علی پور کا ایلی جیسا ایک ہزار چونسٹھ صفحات کا ناول لکھنے والا مختصر ترین خط لکھتا ہے جو وضع قدیم کے القاب و اداب کی گراں باری اور غیر ضروری باتوں کی تکرار سے مبرا ہوتے ہیں۔ میں خود طویل خطوں سے گھبراتا ہوں اس لئے ان کے یہ سہل ممتنع قسم کے خطوط پر لطف معلوم ہوتے ہیں۔

ممتاز مفتی کے پڑھنے کا انداز بھی بڑا باقاعدہ ہے۔ ہر اہم لفظ پر زور دے کر لفظ کے ہر حرف کی آواز کو واضح کر کے ایسے پڑھتے ہیں جیسے املا لکھا رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عادت اسکول ماسٹری کے زمانے میں پڑ گئی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اس طرح نہیں پڑھتے گویا گھاس کاٹ رہے ہیں یا طوفان میل چلا رہے ہیں مفتی کے پڑھنے کا انداز سمجھا سمجھا کر اور قدرے ڈرامائی ہوتا ہے۔

ممتاز مفتی کی ناول نویسی اور نثر نگاری کا اسلوب نہ میرا موضوع ہے اور نہ میں نقاد ہوں کہ اس موضوع پر بات کروں۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک بے باک مصنف اور منفرد پختہ کار اسلوب کے حامل ہیں پچھے دار لفاظ' پرگو جغادری قسم کے لکھاڑ ہیں لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ پیاز کے سے چھلکے اتارتے چلے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کے علی پور کا ایلی ان کی آپ بیتی ہے۔ یہ ناول بھی ایک ادبی ہمالیہ پہاڑ ہے۔ چڑھتے چڑھتے دم پھول جاتا ہے۔ مگر اس احقر نے بھی اس کے ایورسٹ پر پہنچ کر دم لیا۔ شروع کے صفحات سر کرنے کے بعد آدمی اس کے بھول بھلیاں میں گم ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک دنیا آباد ہے۔ بعض عجیب و غریب کردار ہیں مگر شہزاد کا کردار بڑا بانکا ہے۔ وہ بڑی چنچل' چلبلی سرخ و سپید کشمیر کا پکا سیب ہے جس سے ایلی کا دل اٹک گیا ہے۔ مجھے شہزاد کا کردار بڑا زندہ اور جاندار لگا۔ ایک دفعہ میں نے ممتاز مفتی کو لکھا کہ "آپکی شہزاد آج کل کہاں ہے؟ کس حال میں ہے۔ جواب میں انھوں نے یہ دل چسپ فقرہ لکھ بھیجا۔

"عقلی انسان نہیں ہوں' جذباتی ہوں۔ جس سے دل لگ گیا' لگ گیا ذات کا قائل ہوں' صفات کا نہیں۔ وہ جو شہزاد تھی اس سے بھی دل لگ گیا تھا۔ پیاری بھی تھی حرام زدای بھی" اب شاید مرحومہ ہو چکی ہے۔

اکیاسی سال گزارنے اور لاکھوں الفاظ لکھنے کے بعد ممتاز مفتی ادب کے پیر مغاں بن چکے ہیں۔ ہم انھیں سلام کرتے ہیں نئ بچے ان کا دم بھرتے ہیں ان کے یہاں افسانہ' ناول' خاکہ' بیانیہ' نثر' طنزو مزاح سب کچھ ہے۔ بلکہ بعض خاکوں میں تو افسانوں کا افسوں ہے۔ ان کے ہاں حقیقت اور افسانہ گندھے رہتے ہیں------ علی پور کا ایلی اگر ان کی آپ بیتی ہے تو مفتی بڑا طرفہ آدمی ہے میں ان کے متعلق انھیں کے انداز میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ "اوپار و بڑے غضب کا آدمی ہے یہ مفتی' چٹ پٹا' مسالے دار' عاشق تن' صوفی مزاج کدال لئے ڈگر سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے والا' انفرادیت کا جھنڈا اڑانے والا اور اس کی تحریر؟ تحریر کی بنت میں رنگ ہی رنگ ہیں پھندنے ہی پھندنے۔ پاتال سے باتوں کے لچھے نکال کر آکاش کی طرف مرغولوں کی صورت میں اڑاتا رہتا ہے۔ مرغولے ہی مرغولے---"

آیئے ہم دعا کریں کہ خدا مفتی کو اور ان کے قلم کے بانکپن کو زندہ سلامت رکھے۔ آمین

بہتر پہلی صف

موٹروں کی آخری قطار میں ہونا اس سے بہتر ہے کہ آدمی جنازے کی پہلی صف کے سامنے پڑا ہو۔

انعام یافتہ اشتہار

امریکہ کی ایک موٹر ساز کمپنی نے ذیل کے اشتہار کا پانچ لاکھ ڈالر معاوضہ دیا۔

حضرت موسیٰ کوہ طور پر پیدل گئے۔ مگر واپسی پر------ کمپنی کی موٹر میں سوار ہو کر آئے------- (عطیہ افروز... راولپنڈی)

نیلام گھر

ملکہ وکٹوریہ نے اپنے ایک پوتے کو خط میں کفایت شعاری کی تاکید کی۔ پوتے نے وہ خط پانچ پاؤنڈ میں نیلام کر دیا۔----

(علی احتشام ۔ کوئٹہ)

میجک ریالزم

سعادت سعید

ممتاز مفتی ہمہ گیریت کے حامل ایک زیرک ادیب ہیں۔ ان کے فنی اکمال کی گواہی نقادوں کے طبقہ کثیر نے دی ہے۔ انہوں نے اپنے اظہار کے لیے ناول' افسانہ' انشائیہ' سفرنامہ اور شخصیت نگاری وغیرہ کی اصناف کو منتخب کیا۔ اتنے بوقلموں میدان اور وہ ہر ایک میں کامل الفن ہیں۔ افسانہ نگاری ان کے اظہار کا اولین چشمہ ہے۔ باقی ساری رو میں اس کی آمیزش سے وجود میں آئیں۔ انہوں نے جس بھی صنف میں طبع آزمائی کی اپنا لوہا منوایا۔ بام رفعت پر چمکنے والے اس ادبی سورج کی ستائش ہم کیا کریں کہ اس کی شعاعیں خود نما ہیں۔ خوردبینی شیشوں سے اس نے کیسے کیسے ذرے دکھائے ہیں۔ ان کے رنگین تیور اور غیر متوقع گہرائیاں قارئین کو تحیر میں مبتلا کرتی ہیں۔ تو افسانہ نگاری یہی تو ہے۔ ذروں کے قلوب میں جا اترنا اور ان میں متحرک حقائق کو لفظوں کے بطن میں یوں انڈیل دینا کہ ایک نئی کائنات جھلکتی نظر آئے۔ ممتاز مفتی کے فن کا وصف خاص بھی یہی ہے ذروں کے اندر دمکتے آفتاب دکھانا یوں ان کا اسلوب ایک صوفیانہ قدر کا امین ہے۔ ان کا قلم افسوں ساز قاری کو اپنی طلسمی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یونہی تو ان کے افسانوں کے مجموعے تہلکہ نہیں مچا دیتے۔ یونہی تو علی پور کے ایلی نے دماغوں میں گھر نہیں کیا۔ یونہی تو لبیک اور ہندیا ترانے پڑھنے والوں کے شعور کو مہمیز نہیں کیا۔ پیاز کے چھلکے نے شخصیت نگاری کا ایک نیا دبستان کھولا اور "اوکھے لوگ" نے تو اس دفتر خاص میں حرف آخر رقم کیا ہے۔

ممتاز مفتی کا تخلیقی سفر تحلیل نفسی سے شروع ہوا۔ انہوں نے دبی ہوئی خواہشوں کے ایکسرے پر گھومتے افراد کو لفظوں کے کتوں پر تھمایا۔ جبلتوں کو ان کی خالص صورتوں میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ممتاز مفتی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ دور ہندوستان پر نئے علوم کی یلغار کا تھا۔ نفسیات' فلسفہ' سائنس' مصوری' شعر و ادب اور معاشیات کے رنگا رنگ نظریے دماغوں میں راسخ ہو رہے تھے۔ فرائیڈ' یونگ' مارکس' برٹنڈ رسل' ڈارون' آئین سٹائن۔ وغیرہ کے رنگ میں رنگے شعور نو بہ نو خیالات کے آئینے میں متحرک تھے۔ ان رویوں کو صائب جانا جا رہا تھا۔ جنہیں عرف عام میں گستاخ کہا جاتا ہے۔ ایڈیپس کمپلیکس' الیکٹرا عادات' پرو میتھیس بغاوت' ایپ اطوار' اجڑ سیاست' حس بے پردہ اور عقل خالص علم و آگہی کی زنبیل میں کیا کچھ نہ تھا۔ سدھارتھ بدھی' فرائڈ انسانیت اور ذات کے پر اسرار گھنے جنگلوں نے اجتماعی لاشعور سے سر نکالا تھا۔ بادلیئر' رامبو اور میلارمے نے ہماری ادبی بساط پر حسی اور جسمانی علامتوں کی چال چل رکھی تھی۔ ہیو لارڈ' ایلن ایڈگر ایلن پو آسکر وائلڈ ڈی ایچ لارنس وغیرہ کے ترکشوں کے تیر ہمارے کام آ رہے تھے۔ ایسے میں ہمارے ادیب اور شاعر نئے معنوی جلال کے ساتھ منظر عام پر آئے مذہب' جنس' معیشت' سیاست اور افکار کی دنیا میں کھلبلی مچی۔ خیالی اور ماورائی ہستیوں کو ٹھوس موجودگی کا مطیع بنایا جانے لگا۔

تصوراتی اور افلاطونی عشق پر جبلی اور جسمانی محبت کا غلبہ ہوا۔ غیر منصفانہ طریقوں سے کمائی ہوئی دولت استفسار کے روبرو آئی۔ مظلوب اور غلام عوام آزادی کے ترانے گانے لگے۔ تو ممتاز مفتی کیوں پیچھے رہتے انہوں نے اپنا سمبندھ اپنی جوانی کے معاصر ماحول سے استوار کیا۔ اور نئے خیالات کے بلڈ وزروں سے قدیمانہ اخلاقیات کی بیخ کنی کی ہے وہ نئے راستوں پر عہد ساز قدموں کے ہمراہ چلے پرانی خستہ اور کٹی پھٹی زندگی کی تبدیلی ان کے ضمیر کی خلش بن گئی۔ انہوں نے اپنے لہو کے زندگی بخش جذبوں کو پکارا علی پور کا ایلی لکھا۔ تلاش پر بہت تخلیق کی۔ ان کہی' گہما گہمی' چپ' اسمارائیں بہت کچھ لکھا۔ سرکش جذبوں کو اور سرکش کیا۔ آپ نے کھیل کھیلنے کے کھیل کھیلے۔ ن م راشد نے اپنے ایک انگریزی مضمون

The Social in fluences on urdu litrature میں لکھا ہے حالی کے اس خیال نے کہ ماؤں بہنوں بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے نئی نسل کے ادیبوں کو متاثر نہیں کیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ جسمانی محبت کے بارے میں قانونی دائرے کے اندر رہ کر گفتگو کی جا سکے۔ ایسے معاشرے میں جس میں توہمات ایلیا نیشن اور جاگیر دارانہ دباؤ کی وجہ سے پیدا ہونے والی انسانی عدم مساوات ہو جسمانی عدم ابلاغ کے مسائل زیادہ اہمیت اختیار کر گئے چنانچہ میرا جی' عصمت چغتائی' ممتاز مفتی اور راقم الحروف نے جسمانی آزادی کے طربے' شخصی ادھورے پن اور ان

مسائل سے جنم لینے والے اجتماعی بحران پر توجہ مرکوز کی۔ اس امید پر کہ جسمانی ابلاغ کے تیوروں کی مختلف ہستیوں میں ترسیل کی بدولت ایک نئی طرز کی سماجی ہم آہنگی اور کامیابی ظہور پذیر ہو گی" راشد کی یہ رائے خاصی اہم ہے۔ ممتاز مفتی نے حقیقت پسندی کے بے باک انگ دکھاتے ہوئے اپنے افسانوں کے نکیلے نشتروں سے گھٹے ہوئے سماج کے متعفن اخلاقیات پر وار کئے۔ اس دور کے خیالاتی اور فکری سحر سے آزاد ہونے کے بعد انہوں نے اپنی توجہ عمومی انسانی جذبات کی تہہ داریوں کو بے نقاب کرنے پر صرف کی۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود متحیر کرنے والے مشاہدے اور چست ادراک کے اوصاف ان کی تازہ تحریروں میں اور زیادہ نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کے پاس تجزیاتی آنکھ کا بیش قیمت اثاثہ ہے۔ عجیب اور نرالے کی تلاش انہوں نے قرار رکھی ہے۔ وہ سماجی کاٹھ کباڑ میں سے کردار منتخب کر کے انہیں ایسا چوکھا رنگ دیتے ہیں کہ وہ بیش قیمت ہو جاتے ہیں شعور خیر کشادگی کے حامل موضوعات کا انتخاب آج بھی ان کا وتیرہ ہے ہوا صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوائلی شعور کو نئی وسعتوں میں کچھ اس طور گوندھا ہے۔ کہ زندگی کے جزوی نہیں کلی ذائقے سامنے آئے ہیں۔ تنہائی' اجنبیت' خوف' نیستی' اونچ نیچ ظاہر داری حب الوطنی تصوف دینداری جبر اختیار نئے دور کی تیز رفتاری شخصیاتی شکست و ریخت وغیرہ کے موضوعات ان کے لئے اہم ہو گئے ہیں شخصیت نگاری کا رستہ افسانہ نگاری کے بیچ سے ہو گزرتا ہے پیاز کے چھلکے میں عزیز ملک محمد طفیل بانو قدسیہ قدرت اللہ شہاب میراجی منٹو ابن انشا وغیرہ کی شخصیات ممتاز مفتی کی تجزیاتی کٹھالی میں پگھلی ہیں۔ احمد بشیر اشفاق احمد آذر زوبی فکر تونسوی ادا جعفری ذوالفقار احمد تابش سجاد حیدر پروین عاطف اور عکسی مفتی کی شخصیتوں پر اوکھے لوگ میں اظہار خیال ہے بانو قدسیہ قدرت اللہ شہاب پر تازہ خاکے بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

اوکھے لوگ میں جن شخصیات کا مطالعہ ہے ان کے غالب رجحانات کو مختصر عنوانات میں بھی سمیٹا گیا ہے انہیں۔ بانو قدسیہ پتی بھگت دکھائی دی اور ابن انشا جلتا بجھتا احمد بشیر کو پیار سے غنڈہ کہا گیا ہے اور آذر زوبی کو ٹیڑھی لکیر اشفاق احمد انہیں داستان گو نظر آئے اور فکر تونسوی پیاز کا چھلکا ادا جعفری کے لئے پاکیزہ اور سجاد حیدر کے لئے تلتلو گھوڑا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اماں کا کردار باندی کے لفظ میں سمٹا ہے پروین عاطف کا کردار میلہ گھومنی ترکیب میں منعکس ہوا ایسا لگتا ہے ممتاز مفتی صاحب نے ان مجسمات پر طویل نظمیں لکھی ہیں اور انہیں مختصر عنوانات میں مقید کر لیا ہے۔ سو شخصیت نگاری کے لئے جس جوہر شناسی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مفتی صاحب کی ذات ...... کا حصہ ہے۔ غالب نے کہیں لکھا تھا "ستر برس کا ہو گیا ہوں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ میں آدمی نہیں ہوں مردم شناس ہوں" ممتاز مفتی بھی مردم شناس ہیں انہوں نے بھی اپنی زندگی کا کثیر حصہ کرداری مطالعوں کی نذر کیا ہے۔ ان کا لکھا ہوا ہر کردار ادبی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نقش ہو گیا ہے۔ شخصیت کے بھنور جال میں اترنا ہر مصنف کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لئے جزو میں کل اور کل میں جزو دیکھنے کا عمل درکار ہے پھر کہیں جا کے کسی فرد کے بھاؤ پر دسترس ہوتی ہے۔ شخصیت کا بھنور جال چھوٹے موٹے لکھاریوں کو اپنے اندروں سمیٹ لیتا ہے کہ پھر ان کا وہاں سے برآمد ہونا مشکل ہو جاتا ہے لیکن مشاق لکھاری شخصیت کو اپنے اندر سمیٹتا ہے یعنی وہ آفاق میں گم نہیں ہوتا آفاق اس میں گم ہو جاتے ہیں۔ ممتاز مفتی انسانی شخصیت کی تہہ داریوں کو پیاز کے چھلکے کہا ہے۔ انہوں نے انفرادی اختلافات نجی دکھوں اور مسرتوں کے حوالے سے شخصیت نویسی کی ہے اور گہرائی کے اعتبار سے عمر عیار کی اس زنبیل کو کھنگال کر اس میں سے بہت کچھ باہر نکالا ہے ممتاز مفتی انسانی شخصیت کو فقیر کی پیوند لگی گدڑی کے مشابہ جانتے ہیں اور اسے ایک سرائے بھی ٹھہراتے ہیں انسانی ذات کی پرکار سادگی کو پرکھنا ایک مشکل کام ہے مفتی صاحب کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں" اس مجموعے میں ادیبوں کی شخصیتوں پر مضامین ہیں ادیب کی شخصیت عام شخصیت سے اتنی ہی مختلف ہے جتنا پانی مٹی سے ادیب کی شخصیت میں سیال عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ سیال عنصر پارے کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی لہروں میں سمندر کی سی روانی ہوتی ہے مدو جزر اٹھتی ہے۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ جھاگ پیدا ہوتا ہے رو میں چلتی ہیں گھمگھیریاں گھومتی ہیں گرداب پڑتے ہیں ادیب کی شخصیت میں دو خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں شدت اور تضاد وہ چمگادڑ کی مصداق ہے جو بیک وقت چوپایہ بھی ہے اور پرندہ بھی" ممتاز مفتی کی مشاہداتی سفر کی حکایت یہیں تک محدود نہیں ہے گزشتہ بیس برسوں سے وہ باطنی اقلیم کی مسافرت میں سرگرم عمل ہیں وہ مافوق الادراک حسی مشاہدوں کو بھی قلمبند کرنے کی تمنا رکھتے ہیں لیکن انہیں کسی ایسے پیرایہ اظہار کی تلاش ہے جو خوگر پیکر محسوس نظر کے لئے قابل قبول ہو اس منطق سے میں متفق نہیں ہوں اس لیے کہ روحانی تجربات کی نفسیات کی وضاحت کرتے ہیں ولیم جیمز جیسا آدمی تجلی معیارت نہیں اپنا سکا وجود و شہود کے

آسمانوں کی سیر وحدت بینی جینات شناسی آئینہ و پردہ حقیقت کی شناخت وغیرہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد انہیں بیان کی حدود میں منتقل کرنا مشکل تو ہوتا ہی ہے لیکن انہیں اس انداز سے ظاہر کرنا ناممکنات میں سے ہے کہ یقین آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچے۔ Sensoxy Pasception Extra اگر بیان میں منتقل ہو جائے تو بھی اسے ہم منطقی عقل سے وراء مجذوبانہ تحریریں ہی کہہ سکیں گے۔ ان جملہ معترضہ کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی کہ خود مفتی صاحب نے قارئین کے لئے قابل قبول ہونے کی شرط عائد کی ہے ممتاز مفتی کے باطنی تجربات کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اس نوع کے تجربات کے اظہار کے لئے ادبی میدان کا انتخاب ہی کیا ضروری ہے؟

ممتاز مفتی نے او کھے لوگ کی ہر شخصیت کا جو ہر نمایاں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہندی فارسی اردو انگریزی ہر زبان کا استعمال حسب ضرورت کیا ہے انہوں نے بیانیہ تشبیہی اور تمثیلی انداز چابک دستی سے برتے ہیں۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے فقروں کی بنت کچھ اس طور کی ہے کہ لفظوں کا ایک صاف شفاف چشمہ بہتا دکھائی دیتا ہے۔ زبان کا اتنا اجلا اور موثر استعمال بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ممتاز مفتی کے بیانیوں میں جزئیاتی ترسیل مہارت سے ہوئی ہے ایسا لگتا ہے ہموار منظر آنکھوں کے سامنے متحرک ہیں تشبیہی اور تمثیلی انداز کے چند نمونے ملاحظہ ہوں" اس ہندنی میں دیوی بھی اور ناری بھی تھے گتشا ساوتری اور راج نرتکی ایک ہی جسم میں اکٹھی ہو گئی ہوں" پھر یہ کبھی چپ چاپ انڈر گراؤنڈ رینگتی رہی۔ "قدسیہ دراصل ایک ویدر کاک ہے جو ہوا کے مطابق اپنا رخ بدلتی رہتی ہے۔

ابن انشا کی شخصیت جلتے بجھتے مٹی کے دیے کی مصداق تھی بجھ جاتا تو گھپ اندھیرا چھا جاتا جلتا تو بھور سماں بندھ جاتا" "خیر و شر کے لحاظ سے احمد بشیر کیکر کے درخت کی چھاؤں کی مصداق ہے خیر کی گھنی چھاؤں میں یہاں وہاں کئی ایک مقامات پر شر کی کرنیں جگنوؤں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔

اشفاق احمد میں توجہ طلبی کی ماری ہوئی ایک طوائف موجود ہے جو اسوقت قابل تماشہ بن جاتی ہے جب اس میں یہ احساس جاگتا ہے اسے دیکھا جا رہا ہے" "مجھے اس گونگے اکیلے رابنسن کروسو سے شدید لگاؤ ہے جو فرش پر اپنی انا میں لت پت پڑا رہتا ہے۔ "ہم یہ بھول گئے تھے وہ ایک فنکار ایک ٹیڑھی لکیر ہے سیدھا کیا جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔

قدر تو نسوی رشتوں کے لحاظ سے سراسر فیل ہے جو ازلی طور پر اکیلا ہو گونگا ہو۔

کمیونزم کا اژدھا گزر چکا ہے جو چالیس سال کی عمر تک پھن پھیلائے کھڑا رہا اب سوشلزم کی لکیریں باقی ہیں وہ وہ پیٹ رہا ہے۔ محمد طفیل اردو ادب کا الہ دین ہے نقوش ان کا دیا ہے۔ طفیل کے اس گنگا جمنی رنگ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ایک جانب عمر خیام بیٹھے ہوں دوسری جانب چغتائی کی حسینہ اور درمیان میں صراحی اور شیشے کی جگہ جائے نماز اور تسبیح پڑی ہو"

ادا نے کب چاہا تھا کہ میں تار ہی بن جاؤں جسے کوئی انجانا ہاتھ چھیڑ تا رہے اس نے کب چاہا تھا کسی ٹھمری کی دھن پر رقص کرے اس نے کب چاہا تھا کہ اس کی روح میں کوئی چھپے کی بوٹی رکھ دے جو زندگی بھر اندر مٹک مچائے رکھے"

"یونیورسٹی میں وہ یوں گھومتی جیسے مندر میں متبرک گائے"

ممتاز مفتی کی شخصیت نگاری بلا کا رس سمیٹے ہوئے ہے۔ کسی شخصیت کے انفرادی اتار چڑھاؤ کی حکایت رقم کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے شخصیتیں سیدھی بھی ہوتی ہے اور ٹیڑھی بھی پاکیزہ بھی ہوتی ہیں اور ناپاک بھی کھری بھی ہوتی ہیں اور کھوٹی بھی سونا بھی ہوتی ہیں اور پیتل بھی جسم بھی ہوتی ہیں اور روح بھی ان کے پست و بلند کو کوئی قلم صنعت نگار ہی جامہ اظہار دے سکتا ہے۔ کرداروں کے ظاہری حلیوں کی عکاسی ہو یا ان کی نجی زندگی کی تفصیل نویسی ان کے اجتماعی روابط کا بیان ہو یا ان کی تخلیقی قوتوں کا اعتراف ان کی نفسیاتی الجھنیں ہوں یا ان کی فکری پریشانیاں ممتاز مفتی نے ہر ایک طور اور ہر ایک ماحول کو خلوص بھرے حرفوں میں منتقل کیا ہے۔ بھول بھلیوں کی حامل بے ترتیب واقعیں اور اجلی روشن شخصیت ممتاز مفتی کی تحریروں میں منصفانہ اظہار کا حصہ بنی ہیں ان کی دوست شخصیتیں تو ان کے پیار کی مستحق تھیں ہی انہوں نے اجنبی شخصیتوں کو بھی ٹوٹ کر چاہا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے دوستوں کو اتنا خلوص پیش کیا ہے کہ کاغذوں پر بوسے ثبت دکھائی دیتے ہیں اجنبی شخصیتوں کے احوال کا بیان بھی محافقہ آشنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب اپنے اختلاط میں بے تکلف اور گرم جوش ہیں یہی بے تکلفی اور گرمجوشی ان کی تحریروں کو تصنع کی دلدلوں سے بچاتی ہے۔ ان کی شخصیت نگاری ان کے افسانوں کے بطن سے برآمد ہوئی ہے اور ان کے افسانے سماجی دفینوں کا حصہ ہیں تازہ جرات بھرے بے لاگ خوب صورت موثر شعور آفریں خیال آمیا اور تخلیقی جوہر سے مالا مال بیسوی صدی میں مصوری کا ایک دبستان میجک ریالزم کے نام سے مشہور ہوا

جس کی شاخیں اٹلی، جرمنی، نیدر لینڈ اور امریکہ وغیرہ میں موجود تھیں اور اس کے اہم نمائندوں میں جارج گروز اور اوٹوڈکس شامل تھے۔ اس دبستان میں فطری اور فوٹو گرافانہ انداز کی ریالزم کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ یہ مصور فطرت کے عناصر کی رنگوں بھری تشکیل کیلئے بہت کشٹ کھینچتے تھے۔ میجک ریالزم میں ایک نوع کا جذباتی اضطراب اور سسپنس بھی برقرار رکھا جاتا تھا۔ آپ ممتاز مفتی کے شخصیاتی مطالعوں کو پرکھ لیجئے ان میں میجک ریالزم کا لفظی التزام موجود ہے۔ جذباتی اضطراب اور سسپنس کی آمیزش سے وہ کرداروں کی حقیقی تصویر کشی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہر کردار کی لفظی تصویر کشی میں احتیاط اور باریکی سے کام لیا ہے۔ کشٹ کھینچا ہے۔ اس مہوس نے مس خام کو اپنی تخلیق کی آگ میں جھونک کر زرسازی کی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنی کتاب پیاز کے چھلکے میں میرا جی اور منٹو کی شخصیتوں کا احاطہ کرتے ہوئے ادب و اخلاق کے متعدد اصولوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ کافکا اور دوستو سکی کی بیانیہ تکنیکوں سے بھی ممتاز مفتی نے خاصا استفادہ کیا ہے کافکائی بیانئے کا دریا دھیرے دھیرے ایک بڑی علامت کے سمندر میں جا ملتا ہے اور دوستو وسکائی بیانیہ آہستہ آہستہ ماحولی اور کرداری پرتوں کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ ممتاز مفتی کے بیانئے علامتیں وجود میں لاتے ہیں اور شخصیت کو ان کی جزئیات کے تناظر میں اجالتے رہتے ہیں۔ میرا جی کے حوالے سے انہوں نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ اچھا تخلیق کار زندگی کے مناظر سے شدت سے اثر لیتا ہے۔ اسے ہمہ تن سیال بننا پڑتا ہے قاری اسکا اثر قبول کرتے ہیں سیال بننے کے عمل میں فنکار کچھ ایسے تیور بھی دکھا جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس پر تذلیل و تحقیر کے نشتر لگائے جاتے ہیں۔ میرا جی بھی تحسین و تحقیر کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ میرا جی کی کچلی ہوئی انا اور اس کے ردعمل کے طور پر اترنے والے انتقامی جذبے کو ممتاز مفتی نے اپنا خصوصی موضوع بنایا ہے۔ اور انہیں ڈی ایچ لارنس کی ایک نظم کے حوالے سے ایک استادہ سیاہ ستون قرار دیا ہے جو اپنے آتشیں وجود کے باوجود بے بس اور محروم تھا۔ میرا جی کی شخصیت نگاری میں کافکائی بیانئے کا اہتمام ہے ان کی بے بسی اور انتقام کی وضاحت سے متعدد سطریں معمور ہیں۔ منٹو کی شخصیت کے حوالے سے مفتی صاحب نے لکھا ہے "ادیب کی گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے۔ ایک میں کچھ بھی نہیں اور دوسرا میں سبھی کچھ ہوں ایک بہت بڑا اور دوسرا بہت چھوٹا ایک گول دوسرا چوکور عوام کی گاڑی کے پہئے برابر ہوتے ہیں۔ منٹو کی قاتل بوتل اور ان کی نمائش بازی پر پرتیں کھولتے موثر بیانئے میں ممتاز مفتی نے عمدہ اقتباسات قلمبند کیے ہیں منٹو کے exhbitionist ہونے کے حوالے سے مفتی صاحب لکھتے ہیں وہ دکھاوے کا exhibitionist تھا اس نے نمائش بازی کا سیاہ نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ نقاب تلے فیشن سے عاری چیٹ کپڑی گھریلو بیئنس تھی۔ جس کے دل میں شدت کا آرا چل رہا تھا بند بند میں درد کا رچاؤ تھا۔ دیکھنے والی نگاہ تھی۔ بے پناہ خلوص کی دھڑکن تھی۔ یہ مرغی بوتل کے لئے انڈے دیتی رہی کاش یہ انڈوں کو سینا بھی جانتی۔ ممتاز مفتی نے میرا جی کے حلئے اور منٹو کی نمائش بازی کا بیان کرتے ہوئے کھل کر اس اصول کی وضاحت کی ہے کہ ادیب کو اپنے موضوعات کے انتخاب میں محتاط ہونا چاہیے اور یہی نہیں اسے اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ منٹو کے جلد مرجانے کا افسوس کے نہیں ہوا تھا۔ منٹو کی ان تحریروں پر کسے دکھ نہیں ہے جو انہوں نے محض شکم پروری کے لئے لکھیں۔ ہر روز ایک کہانی لکھنا اور بیس روپے لینا یہ کسے یاد نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے منٹو کی شخصیت کو چند لفظوں میں سمیٹتے ہوئے لکھا ہے منٹو نے اپنا آپ یوں لٹا دیا جیسے کسی عورت نے محلے والوں کو اپنی نئی انگوٹھی دکھانے کے لئے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ مفتی صاحب نے شخصیت نگاری کرتے ہوئے ادیبوں کی تخلیقات پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ یہ کام نقادوں پر چھوڑتے ہوئے انہوں نے ایسا خام مواد مہیا کردیا ہے جس سے تحریروں کی تحلیل نفسی میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ نقاد کا کام شخصیت نگاری نہیں ہے وہ ادیب کے فن پر اس کی شخصیت کے اثرات تلاش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ممتاز مفتی کی شخصیت نگاری سے نقادوں کو بھرپور استفادہ کرنا ہوگا تاکہ تخلیقات پر شخصیاتی چھاپ کی کھل کر وضاحت کی جاسکے۔ ممتاز مفتی کی خوردبینی آنکھ کے مشاہدوں کا خزینہ ان کے افسانے ہیں جن میں انہیں نے معاشرے میں بسنے والے مختلف مدارج کے لوگوں کے داخلی کوائف منتقل کیے ہیں۔ اور ادیبوں اور فنکاروں کی شخصیت نگاری کرتے ہوئے ان کی ذاتوں کے سرد خانوں اور خوردوں کو قارئین کے سپرد کیا ہے۔

○

— میں تیس برس سے اپنی کہانیوں پر نقادوں کی تنقید پڑھ رہا ہوں۔ مجھے ان کا کوئی ایک جملہ بھی یاد نہیں۔۔۔۔(چیخوف)

شازیہ یوسفی

حلقۂ دامِ خیال

ستار طاہر

پہلے ممتاز مفتی ہمیں یہ بتاتے رہے کہ آدمی کے اندر کیا کچھ پکتا' ابلتا رہتا ہے اور وہ کسی دن کس طرح اپنا اظہار حیران کن انداز میں کرتا ہے۔

اب ممتاز مفتی ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اندر جو مرضی ہوتا رہے' اوپر سے' اچانک کوئی اور ہی طرح کی "ہونی" ہوجاتی ہے اور آدمی کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

پیشہ ور نقادوں کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ ممتاز مفتی کے فن کو مختلف ادوار میں بانٹ سکیں۔ ایک دور "الکھ نگری" سے پہلے کا' کہ ان پر فرائڈ کا بہت اثر تھا اور بقول بعض نقادوں کے انہوں نے فرائڈ اور اس قبیل کے بزرگوں کی تیار کردہ کیس ہسٹریوں کو افسانوں میں کھپا دیا تھا۔ پھر "الکھ نگری" کی تخلیق کا زمانہ--- اور پھر اس کے بعد کا دور--- تصوف اور ان ہونی وارداتوں کا زمانہ--- لیکن میں جو ممتاز مفتی کا قاری ہوں۔ میں ان کے فن کو مختلف ادوار میں تقسیم نہیں کرسکتا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں--- ان کے کام کو سامنے رکھتے ہوئے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ----- مگر اس سے پہلے ایک اور بات---

خدا جانے ممتاز مفتی نے یہ مشورہ کتنے لوگوں کو دیا ہے یا صرف مجھے ہی اس مشورے سے نوازا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے کہا تھا۔ "اگر لکھنے کے لئے کچھ نہ ملے تو اپنی زندگی لکھنی شروع کردو"

اب یہ بڑا آسان مشورہ ہے اور کچھ بیوقوف تیر بہدف قسم کا بھی--- لیکن ذرا اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں تو وہ سب لکھنے والے جو خیالات' قیاسات اور تصورات کے طوطے مینا اڑایا کرتے ہیں انہیں پسینے چھوٹنے لگیں گے کیونکہ زندگی اور پھر اپنی زندگی کو موضوع بنانا دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ لکھنے والے کی ذات کسی نہ کسی حد تک اس کی تخلیق کا حصہ بنتی ہے لیکن جوں کی توں نہیں--- بہت کچھ تبدیل ہوجاتا ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے لئے ممتاز مفتی کی شخصیت اور فن--- دونوں کی مختلف ادوار میں تقسیم ممکن نہیں۔ طالب علم کی حیثیت سے میں تو ممتاز مفتی کے بارے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ--- وہ جب سے لکھ رہے ہیں' اپنی ہی زندگی لکھ رہے ہیں' جو "غیر" قسم کے کردار ان کے ہاں دکھائی دیتے ہیں ان کی مدد سے بھی دراصل وہ اپنی ہی زندگی کو بیان کر رہے ہوتے ہیں--- سچ تو یہ ہے کہ ممتاز مفتی نے جتنا اپنے آپ کو تختہ مشق بنایا ہے اس کی مثال شاید دنیا کے ادب میں کم ہی ملے۔

ان کی زندگی کا سارا بیانیہ ان کے فن میں ملتا ہے۔ ہاں کہیں وہ تھوڑی سی احتیاط سے کام لیتے ہیں' لیکن بالکل ہی کھل جاتے ہیں۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ "الکھ نگری" کی بہت سی قسطیں میری ادارت میں ایک رسالے میں شائع ہوئیں۔ کچھ اقساط ایسی بھی ہیں جن کے آخر میں ممتاز مفتی نے کچھ کرداروں کے بارے میں میرے لئے وضاحت کی کہ فلاں کردار--- اصل میں فلاں زندہ آدمی ہے۔ بہرحال یہ وضاحت صرف میرے لئے ہوتی تھی۔ اشاعت کے لئے نہیں--- یہ رویہ ممتاز مفتی نے خوب نبھایا ہے۔ لیکن وہ قدرت اللہ شہاب کے حوالے سے بالکل ہی کھل جاتے ہیں اور کہیں--- محتاط ہو کر اصلی نام دینے سے اجتناب کرتے ہیں---

ممتاز مفتی نے دستوو سکی کے "ایڈیٹ" کا بھی خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ حالانکہ مجھے ان کی ذات میں ہمیشہ "برادرز کرامازوف" کے تینوں بھائیوں کے متضاد اور متصادم عناصر یکجا دکھائی دیئے ہیں۔ یہ بات بھی میں ممتاز مفتی کی تخلیقات کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں جو ان کی اپنی سوانح ہیں۔ ممتاز مفتی کی اپنی ذات اور ان کی تخلیقات "حلیم" کی طرح ہیں۔ بہت سے اعلیٰ' بہت سے متضاد اور متصادم عناصر اس "حلیم" میں گھل مل کر یک جان ہوگئے اور اس حلیم کا ذائقہ سب سے مختلف اور منفرد ٹھہرا---

میں نہیں جانتا آپ ممتاز مفتی کو کتنا جانتے ہیں--- میں انہیں جتنا جانتا ہوں' اس کا ذریعہ ان کی تخلیقات ہیں--- باہمی تعلقات کے حوالے سے میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ انہوں نے مجھے اس کا کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ ایک دن اچانک مجھے ان کا ایک خط ملتا ہے۔ یہ خط--- صرف ایک سطر پر مشتمل تھا۔ اس ایک سطری خط میں مجھے انہوں نے اطلاع دی تھی کہ اب میں راہ راست پر آگیا ہوں۔ بہت سوچا' غور کیا--- کچھ

باقی صفحہ ۴۲ پر

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (بھارت)

کافر بھی نہ تھے صاحب ایماں بھی نہیں تھے
ہم راہ سے بھٹکے ہوئے انساں بھی نہیں تھے

جو تو نے کئے ہم سے سوال اے دل پر فن!
مشکل تو نہیں تھے مگر آساں بھی نہیں تھے

بالا نہ ہوا گرچہ کبھی نرخ ہمارا
بازار میں لیکن کبھی ارزاں بھی نہیں تھے

ہر شخص کو مانا کہ نظر آ نہ سکے ہم
ہم دیدۂ مشتاق سے پنہاں بھی نہیں تھے

اب تک نہ ہمیں خاک وطن تو نے بھلایا
تجھ سے تو کچھ اس طرح کے پیماں بھی نہیں تھے

آنکھوں پر بٹھایا تو کبھی دل میں بسایا
ہم کو جو تری شان کے شایاں بھی نہیں تھے

فرقت ہی گلے میں تھی بس ایک پھانس و گرنہ
ہم اپنی وفا پر تو پشیماں بھی نہیں تھے

کیوں تجھ سے جدا ہو کے بھی زندہ ہیں ابھی تک
ظاہر میں تو اس بات کے امکاں بھی نہیں تھے

ڈاکٹر افضل اقبال

واعظ و پیر مغاں تک پہنچی
اپنی رسوائی کہاں تک پہنچی!

جو کبھی کی تھی حرم والوں سے
بات وہ کوئے بتاں تک پہنچی!

شب کو بالیں سے مری سرگوشی
انجم و کاہکشاں تک پہنچی!

بحر امید کی موہوم سی موج
اب کہیں ریگ رواں تک پہنچی!

دل سے ٹکرائی جو دزدیدہ نظر
آگ وہ بھڑکی کہ جاں تک پہنچی!

آخرش سب پہ ترا راز کھلا
بات پھر وہم و گماں تک پہنچی!!

خالد محمود عارف

زندگی بے خلل نہ ہو جائے مسئلہ کوئی حل نہ ہو جائے
محو گردش خلا میں ہوں جب تک ہر ستارہ کنول نہ ہو جائے

خواب بنتا رہوں گا میں---- جب تک
ساری دنیا غزل نہ ہو جائے

جب تک اک جھونپڑا بھی باقی ہے
"قبر" کوئی "محل" نہ ہو جائے

اشک نغمے نہ پائیں گے جب تک
ریت کا "تھل" یہ جل نہ ہو جائے

آدمی---- بدعمل گوارا ہے
آدمی----بے عمل نہ ہو جائے

ہانپنے لگ گئی زمین عارف
ایک صدی---- ایک پل نہ ہو جائے

○

حمیرا رحمان (نیویارک)

ہمیں جو عالم ہو میں ابھی اٹھانا ہے
صدا وہ چیخ کی مانند وحشیانہ ہے

مرے ضمیر کی خاموش اس عدالت میں
ہر ایک شخص کا برتاؤ جارحانہ ہے

کتاب اسکے لئے ایک آڑ ہے سب سے
اسے یہ کھیل تو ہر حال میں نبھانا ہے

یہ لوگ وہ ہیں جنہیں علم کچھ نہ دے پایا
سو گفتگو کا ہنراب بھی جاہلانہ ہے

نہ جانے کون کہاں چھپ گیا ہو گھات لگائے
اب اڑنے والوں کا پرواز ہی ٹھکانہ ہے

ہمیں سفر کئے دس سال سے زیادہ ہوئے
مگر قیام ابھی تک مسافرانہ ہے

حمیرا جو بھی کہو گی ضرور سن لوں گی
کہ ان دنوں مرا خود سے بھی دوستانہ ہے

○

سلطان رشک

وجہ سکون زیست ہے فیضان اضطراب
دیکھی ہے ہم نے وسعت دامان اضطراب

آوارگان شوق سے یہ بھی نہیں بعید
سر کر لیں ایک جست میں میدان اضطراب

بس ایک بار چشم توجہ میری طرف
تیرے سوا کہیں نہیں درمان اضطراب

وہ خوش نصیب ہے جسے حاصل جہاں میں ہے
ذکر حبیب و گوشہ درمان اضطراب

وہ شخص تیرگی سے گریزاں نہیں رہا
مخفی تھا جس میں نیرِ تاباں اضطراب

میرا سکون سعی مسلسل کے دم سے ہے
میں مطمئن رہا تہِ دامان اضطراب

O

افضل گوہر (کوئٹہ)

تنگ اتنا لگ رہا ہے شہر کا دامن مجھے
مختصر کرنا پڑے گا گھر کا بھی آنگن مجھے

زندگی میں اس قدر اپنوں سے کھائے ہیں فریب
ایک سے لگتے ہیں اب تو دوست اور دشمن مجھے

گھر کے باہر روز ملتا ہے ہجوم سنگ زن
دل کی صورت کیا ملا ہے کانچ کا برتن مجھے

تو مجھے مال غنیمت سے کوئی خلعت نہ دے
زیب دیتا ہے فقط اپنا ہی پیراہن مجھے

کاش! چھوڑ آئے مقام عہد رفتہ تک کوئی
ڈھونڈتا ہو گا کھلونوں میں مرا بچپن مجھے

O

نیر بجلی

طوفان یاس میرا سفینہ ڈبو گیا
اے میرے بے نیاز خدا تو کہاں پہ تھا

سب کچھ لٹا کے اپنا زمانے کے شوق میں
اب سوچتا ہوں مجھ کو زمانے نے کیا دیا

نہ کوئی نوحہ گر تھانہ پھولوں کی چادریں
حسرت سے اپنی لاش کو خود دیکھتا رہا

اب اس سے بڑھ کے تم ہی بتاؤ میں کیا کروں
میں نے تو ہنس کے زھر کا پیالہ بھی پی لیا

کرتے تھے تم تو روز بہاروں کے تذکرے
آئی ہے کس دیار سے جلتی ہوئی ہوا

کس کس کے گھر پہ دیکھئے ٹوٹیں گی بجلیاں
بل کھا رہی ہے شہر پر امڈی ہوئی گھٹا

دیکھا تو وہ تو خود ہی تھا میری تلاش میں
میں جس کی جستجو میں سدا سرگراں رہا

کہنے کو تو وہ تھے رگ جاں سے قریب تر
جب ڈھونڈنے چلے تو تھا صدیوں کا فاصلا

گہنا گئی ہیں اسکو زمانے کی گردشیں
دیکھو تو آج نیر اعظم کو کیا ہوا

○

احمد ہاشمی

کتنی سچائیوں کی ہے غماز
روح کی سن تو لے کبھی آواز

اپنے اپنے ہیں زندگی کے طریق
اپنا اپنا ہے سوچ کا انداز

دل میں دھرتی کا دکھ چھپائے ہوئے
سوئے افلاک ہے مری پرواز

دور تک جائیں گے خیال مرے
دور تک جائے گی مری آواز

کون جانے ہے کیا کسی دل میں
کون جانے کسی نگاہ کے راز

چھین لی تو نے ہر خوشی دل کی
میرے محبوب تیری عمر دراز

دل کی بستی اجاڑ کر احمد
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اس کا جواز

○

جواد الرحمن

"محبت کا سفر"

میں چل پڑا ہوں مگر خبر ہے

محبتوں کا کٹھن سفر ہے

یہ وہ ڈگر ہے

کہ جس کا حاصل ہے کوئی منزل ---- نہ کوئی منظر

نہ راستے میں کوئی شجر ہے

مگر عجب ہے

کہ چلتے چلتے جو تھک گئے تم

تو حوصلہ جس قدم پہ ہارو

وہیں پہ گھر ہے

وہیں پہ اک ریشمی سے پتھر کا سنگ در ہے

سفر نہیں ہے یہ رہ گزر ہے

مجھے خبر ہے

کہ اس کے راہی سدا کے راہی گنے گئے ہیں

کہ ان کی خاطر سدا سے پتھر چنے گئے ہیں

مگر وہ راہی کہ جن کی پیاسیں

لہو بہا کر بھی بجھ نہ پائیں

انہی کے قصے، کہانیوں میں سنے گئے ہیں

مجھے خبر ہے

کہ یہ محبت، یہ بے مروت

اسی کی ہے جو

بھلا کے منزل

جلا کے حاصل

لٹا کے دریا

گنوا کے ساحل

قدم بڑھائے

ستم اٹھائے

مگر زباں پر نہ حرف لائے

وہ اس کی آنکھوں میں معتبر ہے

اسی ڈگر کا تھا میں مسافر

مگر میرے سامنے منازل

(افق پہ بہتا ہوا سا کاجل)

میں ان دھندلکوں میں جا رہا تھا

مگر عیاں تھی

وہ میرے قدموں کی ڈگمگاہٹ

(وہ دل کی آہٹ)

تھے سب کی آنکھوں میں میرے آنسو

جو بہہ رہے تھے

میری کہانی وہ کہہ رہے تھے

مگر میں پھر بھی رواں دواں تھا

(کہ یہ زمانے کا درد جاں تھا)

بھٹک کے اک سمت مل گئی تھی

اور اب کہوں کیا

کہ دل دھڑکتا ہے اب بھی لیکن

پر اس کی دھڑکن عجیب سی ہے

کہ زندگی ہی رقیب سی ہے

میں مانتا ہوں

محبتوں پہ ندامتوں کا بڑا اثر ہے

کٹھن سفر ہے !!!

وفا چشتی

"نور" کا کہکشاں اور مٹی"

مرے وجود کے تاروں سے وقت کا فنکار
خدا کرے کہ تراشے تمہارے نقش ونگار

تو زندگی کی علامت ہے سورجوں کی طرح
تو بے مثال ہے بے مثل جنتوں کی طرح

تری خزاؤں میں آباد مشک و بو کے جہاں
تری بہاروں میں روشن ہے نور کا کہکشاں

ترے جمال سے خیرہ بصارت لولاک
ترے جلال پہ حیراں جلالت افلاک

مرا لہو ترے رخ کی بہار ارض وطن
نگار وقت ہے تجھ پر نثار ارض وطن

○

محمد مشتاق آثم

امان

پیاس دشت کربلا میں گونجتی آواز ہے
تشنگی صحراؤں میں جلتے ہوئے ذروں کی چیخ
ہجرتوں کے اس سفر میں
درد کی اندھی گزر گاہوں کی سرحد سے پرے
میں کہ شہر آشتی و امن کا طالب رہا
شہر جس میں پیار اور انصاف کے دریا بہیں
آج صدیوں کے سفر کے بعد جب در وا ہوئے
میں نے دیکھا
بے کرم
بے مہر کوفہ
میرا گھر
میرا نگر

○

ارشد نعیم

ہائیکو

وصل کی فصل کاٹنے تک وہ
سارے رستوں کو کاٹ ڈالے گا
وقت کے ساتھ رابطہ رکھو!

اپنے حصہ کی چند خوشیوں کو
غم کی بستی سے ڈھونڈنے والو
پہلے مفہوم زندگی سمجھو!

ہم جفاؤں کا تعاقب کرتے
اس کے در تک پہنچ گئے لیکن
دل کو پھر بھی یقین نہیں آیا

تم سے کچھ روز مل نہ پاؤں تو
دل کی بستی اجاڑ ہو جائے
رونقیں تو تری گرفت میں ہیں

راحتوں کو خریدنے کے لئے
ہم نے خود کو بھی، بیچ ڈالا ہے
جیسے سب کے ضمیر مردہ ہیں

○

عبد القدوس قدسی

ھائیکو

اے سمندر! تو آ کے ساحل پر
کب خزانے انڈیل دیتا ہے
روز لوٹاہوں میں تو خالی ہاتھ

قطرے بارش کے آسماں پر ہی
چن کے پھر پی گئیں ابابیلیں
تشنہ لب ہی ہوں میں زمیں پہ آج

سرخ چنگاریاں زبیر کی
ایک منظر حسین تھا لیکن
جسم چھلنی تھے نوجوانوں کے

چاندنی شب میں چاپ قدموں کی
ہر دل میں خوشی کی لاتی ہے
صبح تک پھر اداس رکھتی ہے

چاند جس رات پورا ہوتا ہے
نیند آنکھوں سے دور ہوتی ہے
میں ترا انتظار کرتا ہوں

بکھری یادیں سمیٹ کر قدسی
ہائیکو کے حسین لفظوں میں
میں تجھے بے نقاب کرتا ہوں

○

زندگی ۔ اگلی صدی کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ ہمارے ملک کے صاحب طرز ادیب اور بالغ نظر محقق و دانشور جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے پاکستان کے حوالے سے آنے والے وقت کے مضمرات اور چیلنجوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس بے حد اہم علمی و فکری بحث پر اظہار خیال کرنے کے لئے "چہار سو" کے صفحات اہل فکر و قلم کی توجہ کے لئے حاضر ہیں۔
(گلزار جاوید)

جدھر جائیے' اخبارات اٹھایئے' مضامین پڑھیے' گفتگو کیجئے ہر طرف ' ہر محفل' ہر مجلس میں اکیسویں صدی کا ذکر ضرور آتا ہے۔ ہر شخص یوں انتظار کر رہا ہے جیسے اکیسویں صدی من و سلویٰ کی صدی ہوگی' ہر طرف خوشیوں کا بازار گرم ہوگا اور ہر طرف امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی اس ارض خاکی پر حیوان ناطق کو ضرورت ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس صدی میں مسرتوں سے لبالب بھری زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ کیوں نہ تاریخ انسانی کی ورق گردانی سے اکیسویں صدی کی فال نکالی جائے تاکہ آنے والی صدی کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجائے۔ معاً خیال آیا کہ اب سے تقریباً دس سال پہلے بھی چودھویں صدی ہجری ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئی تھی اور پندرھویں صدی ہجری نے وقت کی دہلیز پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اہل پاکستان نے اس صدی کا بھی ایسے ہی انتظار کیا تھا جس طرح اکیسویں صدی عیسوی کا کر رہے ہیں لیکن ہوا یوں تھا کہ ایک دن مغرب کے وقت' جب دونوں وقت ملتے ہیں' پندرھویں صدی ہجری طلوع ہو گئی تھی اور پھر دو چار مہینے کے شور شرابے اور جذباتی عمل کے بعد یہ بھی وقت کی ریت پر اسی طرح جا سوئی تھی جس طرح تیرھویں صدی عیسوی میں' بغداد پر تاتاریوں کے حملے کے بعد' ہماری صدیاں خواب غفلت کی چادر لے کر گہری نیند جا سوئی تھیں۔ اگر یہ منظر ہماری نسل نے دس سال پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تو اب بھی اکیسویں صدی کی آمد ہمارے لیے ایسی ہی ہوگی۔ ممکن ہے 31۔ دسمبر 1999ء کی رات کو ہمارے نوجوان سڑکوں پر نکل آئیں اور پٹاخے چلا کر' پھلجھڑیاں چھوڑ کر اور رنگ برنگ کے گولے فضا میں داغ کر ذرا دیر کو زندگی کی جذباتی و رومانی رونقوں میں اضافہ کر دیں۔ اور پھر وہی دن ہوں اور وہی راتیں جن سے ہم گزشتہ سات سو سال سے گزر رہے ہیں۔۔۔۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے' عمریوں ہی تمام ہوتی ہے۔ اگر اکیسویں صدی کا انتظار فی الحقیقت کیا معنی رکھتا ہے؟۔

مجھے تو کچھ یونہی معلوم ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ زندگی کا ایک سیدھا سادا دائمی اصول ہے کہ آپ جو آج بوتے ہیں کل وہی کاٹتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ جو بوئیں اور کل گندم کاٹیں۔ آج ہم نے جو کچھ بویا ہے اور جو کچھ بوئیں گے وہی اکیسویں صدی میں کاٹیں گے۔ اپنے چاروں طرف نظر دوڑایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ہم نفرتیں بو رہے ہیں' ہم ناانصافیوں سے معاشرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں' ہر شخص ایک دوسرے کے حقوق سلب کر کے اپنا الو سیدھا کر رہا ہے' جبر ہمارا مزاج ہے' استحصال اور ناانصافی ہمارا مسلک ہے' فرقہ پرستی اور قبائلی انداز نظر ہمارا اصول حیات ہے' اختلاف ہماری عادت ہے اور اسی لیے جہاں اختلاف نہیں ہے وہاں ہم اختلاف کے بیج بو کر نئے نئے فتنوں کو جنم دے رہے ہیں' اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا کر نئے نئے فرقوں کو اس لیے جنم دے رہے ہیں تاکہ ہم وقتی طور پر سیاسی فائدہ اٹھا سکیں۔ اسلام کے نام پر مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ ذرا ذرا سے ذاتی فائدوں کے لیے کور چشمی اور بے حیائی سے اس طرح کر رہے ہیں کہ ہمارا ضمیر بھی مر گیا ہے۔ جبر کی کھیتی میں نفرتوں کی کھاد اور افتراق و اختلاف کے بیج ڈال کر ہم تیزی سے اکیسویں صدی کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اور نادانی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اکیسویں صدی ہمارے لیے گل و گلزار بن کر خوشیوں کی خوشبوئیں بکھیرنے والی صدی ہوگی۔

غور کیجئے کہ اوپر سے نیچے تک کتنے لوگ ہیں جو آج بامعنی و بامقصد زندگی گزارنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جسے دیکھئے رزق حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر دولت بٹورنے کے عمل میں دن رات لگا ہوا ہے۔ زر

پرستی ہماری زندگیوں میں اس طرح در آئی ہے کہ خدا سے پناہ مانگنے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی۔ ہم بے عمل' بے مقصد اور بے معنی زندگی گزار کر اپنے معاشرے کے پانی کو اتنا گندا اور غلیظ کر چکے ہیں کہ اب اس میں سے نکلنے والی تیز بدبو ناک کے بال تک جلائے دے رہی ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ بھی اسی طرح جانتے ہیں جس طرح میں جانتا یا محسوس کرتا ہوں لیکن ہم علاج سے گریزاں' عمل و تدبیر سے دور' بے علمی کی بیساکھیوں پر گھسٹ رہے ہیں اور بقول سرسید "ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوا لے اور دوا کا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ لکھوا لینے سے بیمار کو شفا ہو جاوے"۔ موجودہ صورت حال میں مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاید اکیسویں صدی میں بھی اسی صورت سے زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ غور کیجئے کہ ہم نے اپنے عمل سے' اپنی فکر سے' اپنی جدوجہد و تدبیر سے ایسی کون سی تیاریاں کی ہیں کہ اکیسویں صدی' ہماری زخموں سے نڈھال بیسویں صدی سے کچھ مختلف ہوگی۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مغربی دنیا کے جو تیور ہیں' ہوائیں جس سمت چل رہی ہیں' ان کے حساب سے اکیسویں صدی ہمارے لیے نئے مسائل و مصائب کی صدی ہوگی۔ اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی دنیا کی ساری اقوام نے اپنی منزل مقرر کر کے اکیسویں صدی میں نہ صرف داخل ہونے کی تیاریاں کر لی ہیں بلکہ دس سال پہلے ہی اس صدی میں داخل ہو چکی ہیں۔

قومیں علم و آگہی سے بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ قومیں نفرتوں' بے معنی اختلاف اور فسادات سے نہیں بلکہ اتحاد' اتفاق اور تدبیر سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہم اس سطح پر بھی دنیا کی بیشتر اقوام سے کمزور اور پیچھے ہیں۔ ہم " اقراء " کی تلاوت کرتے ہیں اور باآواز بلند کرتے ہیں' علم کے تعلق سے اللہ اور رسول کے احکام کا بار بار اعادہ کرتے ہیں لیکن حصول علم کے شوق و جذبہ سے عاری ہیں۔ اس صورت میں اکیسویں صدی' جو آٹھ سال بعد آنے والی ہے' وہ بھی ہمارے لیے یقیناً جہل و لاعلمی کی صدی ہوگی اور وہ اس لیے بھی کہ ہم نے جو کچھ آج بویا ہے وہی کل کاٹیں گے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم ہر دم اسلام کی تسبیح پڑھتے ہیں لیکن اپنے عمل سے ہم نے اپنے باطن میں اسلام کو مسترد کر رکھا ہے۔ ہم انفرادی و اجتماعی طور پر احکام قرآن کی جس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہیں وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم نے اسلام کا نسخہ تو لکھوا لیا ہے لیکن نسخے میں لکھی ہوئی دوا استعمال کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ معاملات زندگی اور معاملات انسانی کے تعلق سے قرآن پاک میں جو ہدایات آئی ہیں آپ ان کی فہرست مرتب کر لیجئے اور اس فہرست کو اپنے اعمال سے ملا کر دیکھیے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ ہم اسلام کے حوالے کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری موجودہ روش سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی یہی صورت حال برقرار رہے گی۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ ہم سب اسلام کا ہر وقت نام لیتے اور شور مچاتے ہیں لیکن اس کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔

ہمارے شور شرابے کی وجہ سے دشمن اسلام تو بیدار ہو گیا ہے لیکن ہم خود اس کی حکمت عملیوں سے غافل ہیں۔ اس وقت ساری مغربی دنیا اور امریکہ میں "بنیاد پرستی" کا لفظ کثرت سے بار بار استعمال ہو رہا ہے اور یہ عیسائی تصور' شور مچانے والے بے عمل اور غافل مسلمانوں کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری استعمار پسند' سرمایہ دار مغربی اقوام متحد ہو کر اسی طرح بنیادی پرستی پر حملہ آور ہوں گی جس طرح ان سب نے مل کر اشتراکیت پر ہلا بولا تھا۔ اب ان سے مقابلہ کرنے والا سوویٹ روس' میخائل گوربو چوف کے ہاتھوں' ختم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اب انہیں اپنے حریف کے طور پر صرف مسلمان نظر آ رہے ہیں جو شور تو مچا رہے ہیں لیکن آگے بڑھنے کی تدبیر سے غافل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ' اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اسی کام کے لیے وقف ہوگی جس میں بنیاد پرستی کو ختم کرنے اور محکوم بنانے پر عمل درآمد ہوگا۔ ایک طرف ہندوستان ہوگا اور دوسری طرف اسرائیل ہوگا جس کے سروں پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا دست شفقت ہوگا اور بیچ میں اختلاف و احساس کمتری کی ماری' غیر متحد اور بے شعور و بے تدبیر مسلم دنیا ہوگی جسے بنیاد پرست کہہ کر محکوم بنانے کی تدبیریں کی جا رہی ہوں گی۔

خواتین و حضرات! یہ تصویر یقیناً پریشان کن ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ خیالی دنیا میں مگن اور مست رہنے کے بجائے ہم اس صورت حال کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھ لیں تاکہ اس وہ شعور پیدا ہو جس سے تدبیر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اگر آپ بیسویں صدی پر نظر دوڑائیں تو یہ صدی اپنے زخموں سے چور اور لہو لہان ہے۔ اس وقت فکری سطح پر بیسویں صدی کے پاس کوئی

نظام فکر موجود نہیں ہے اور ساری اقوام عالم نئے نظام اور نئی فکر کی تلاش میں سرگرداں ہے تاکہ اکیسویں صدی میں وہ اعتماد کے ساتھ داخل ہو سکیں۔ انیسویں صدی نے اہل مغرب کو وہ نظام فکر دیے تھے۔ ایک وہ نظام استعمار تھا جس پر چل کر مغرب نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اپنی سائنسی ترقی مدد سے ایک ایسا استعمار پسند سرمایہ دارانہ نظام قائم کیا تھا جس کا مزا وہ بیسویں صدی میں خود بھی دو عالمگیر خونیں جنگوں اور ایک تیسری سرد جنگ کی صورت میں چکھ چکی ہے۔ بیسویں صدی میں یہ منظر ہم نے خود دیکھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب مغلوب و محکوم اقوام پھر آزاد ہونا شروع ہوئیں اور آج دنیا کی بیشتر اقوام بظاہر آزاد ہو چکی ہیں۔ دوسرا مارکسی اشتراکی نظام تھا جس نے بیسویں صدی کے انسان کو جنت ارضی کا خواب دکھایا تھا اور سترہ اٹھارہ مہینے پہلے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ نظام اندر سے کھوکھلا ہو کر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے کوئی کمزور بنیاد اونچی عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے۔ ایک ایسا نظام جو عدل و مساوات سے دنیا میں امن و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کر سکے۔ اور حسن اتفاق سے اس وقت اسلام ہی وہ نظام فطرت ہے جو دنیا کے سارے مادی، فکری اور روحانی تقاضے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح ہم اور ساری دنیا ایک نئے عہد کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ یہ صورت حال جو آج موجود ہے صدیوں میں کبھی کبھار یہ صورت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ کام صرف شور مچانے اور اسلام کا صرف ڈھول پیٹنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ تدبر و تفکر سے اسلام کو عالمی فکری طاقت بنانے سے ہو سکتا ہے۔ اسلام کو عہد حاضر کی زبان اور اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بیسویں صدی کے تاتاریوں کی روح کو مسخر کیا جا سکے۔ یہ کام اختلاف کے فتنے جگانے، محض اپنی سیاسی دوکان چمکانے کے لیے اپنے معاشرے کے باطن میں فرقہ پرستی کو ابھارنے، جہل اور غفلت سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ہمیں اپنے ذہن کے بند دریچوں کو کھولنا ہوگا۔ ہمیں اس وقت امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کی ضرورت ہے جو کھلے دل و دماغ سے عہد حاضر کے مسائل کو سمجھ کر اس کا حل تلاش کرے اور اسے ایک نظام کی صورت میں پیش کرے۔ سچے دین فطرت کی ترویج و اشاعت کا اس سے بہتر موقع بیسویں صدی کے آخر میں آج صدیوں بعد آیا ہے۔ خدارا اسے ضائع مت کیجئے۔ اسی عمل سے، اسی راستے سے آپ اکیسویں صدی کو اپنی صدی بنا سکتے ہیں۔ پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا اس میں آگے دیکھنے، بڑھنے اور سوچنے والے ایسے معاشرے کو جنم دینے کی ضرورت تھی جو ساری دنیا کے لیے مثال و نمونہ بن سکتا لیکن ہم نے اس معاشرے کو ناانصافیوں کا گہوارہ، جبر و استحصال کا گڈونا بنا کر بے ایمانیوں اور زرپرستی کا بازار بنا دیا۔ اس صورت میں اکیسویں صدی ہمیں اور اکیسویں صدی کو ہم کیا دے سکیں گے؟۔ یہ سوال ہماری لوح تقدیر پر جلی حرفوں میں لکھا صورت سوال لٹک رہا ہے۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کوئی دو سال کا عرصہ ہوا امریکہ کے ایک دانشور اور فرانسس فوکو یاما کی ایک کتاب

"The End of History and the Fast Man"

کے نام سے شائع ہوئی جس میں سوویت روس کے ٹوٹنے کے عمل کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا معاشرتی، معاشی و سیاسی نظام مارکسزم / سوشلزم کے آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے کیونکہ وہاں ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ موجود ہے جہاں ہر شخص اپنی پسند کی ہر چیز حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے، فوکو یاما صاحب فرماتے ہیں کہ "آپ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ امریکی معاشرے میں مالدار روسی اور چینی بستے ہیں اور روس و چین میں غریب امریکی آباد ہیں جو مالدار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ وہ لکھتا ہے کہ اس اعتبار سے امریکی معاشرہ مارکسی نظام کے آخری مرحلے پر کھڑا ہے اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ اور یہی اس کا نظریہ ہے کہ اب ان معنی میں تاریخ کا عمل ختم ہو گیا ہے اور اب آئندہ نظریاتی جنگوں کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آزاد جمہوریت یعنی لبرل ڈیموکریسی کا نظام قائم ہوچکا ہے اور ساری دنیا اب اسی نظام کی طرف سفر کر رہی ہے۔ یہی انسانی نظام کی آخری منزل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس نظام کی کامیابی کے دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اس معاشرہ نے سائنسی ترقی سے نیچر کو مسخر کر لیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرے سائنس و ٹیکنالوجی کے اعتبار سے جتنے طاقتور ہوں گے وہ ان معاشروں پر غالب و حاوی رہیں گے جو سائنس و ٹیکنالوجی کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سائنس کے ذریعے فطرت کو مسخر کرنے والے معاشرے بہتر انتظام کے حامل ہیں اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے تجارتی اداروں، منڈیوں اور سرمایہ دار صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے اپنی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت

فراہم کر دیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خود کو پہچانے جانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ آزاد جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر رہ کر ہر شخص تدبیر و محنت سے اپنی اس خواہش کو پورا کر سکتا ہے اور یہ بات کہہ کر فوکویاما یہ باور کراتا ہے کہ بس یہی وہ نظام ہے جسے اب دوام حاصل ہوگا۔

غور کیجئے تو یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فلاحی مملکت اور معیار زندگی کے تعلق سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس میں جبر و استحصال' استعماریت' نو آبادی نظام اور دنیا کی عظیم تہذیبوں کو تباہ و برباد اور ان کے وسائل پر قبضہ کرکے حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی وہ یہی کرے گا۔ اس کی ایک جھلک ہم خلیج کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ کا مرکز بغداد کی تہذیب تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی جس کے باعث ہم سات سو سال سے آج تک پسماندہ' کمزور اور بے اعتماد چلے آرہے ہیں۔ اب بیسویں صدی کے تاتاریوں نے دوبارہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر نہ صرف سارے مشرق وسطیٰ کے وسائل پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرنے کے لئے نئی نئی تدبیریں کی جارہی ہیں۔ یہ ہے وہ لبرل ڈیمو کریسی جسے فوکویاما انسانی نظام کا آخری مرحلہ کہتے ہیں جس میں دور بربریت کا اصول--- "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کارفرما ہے اور اسی اصول کے پیش نظر امریکہ کے ایک اور دانشور جوزف نائی (Joseph Nye) کہہ رہے ہیں کہ "امریکہ دنیا کی حکمرانی کے لئے پیدا ہوا ہے" اور فوکو یاما کہہ رہے ہیں کہ لبرل ڈیمو کریسی کے ذریعے اب دنیا تاریخ کے آخری مرحلے پر آچکی ہے۔ اس وقت سارا امریکہ اور سارا مغرب "بنیاد پرستی" کے خلاف نعرہ لگا کر صف آرا ہو رہا ہے۔ مثنوی مولانا روم' تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد کی تباہی کے بعد' مسلم امہ جس صورت حال سے دوچار تھی' اس کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اسی لئے اس میں ایسی حکایات کے ذریعے اعتماد بحال کرنے اور مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی اس وقت مسلم امہ کو ضرورت تھی۔ مولانا روم نے ایک حکایات میں لکھا ہے کہ ایک جنگل میں ایک زبردست شیر رہتا تھا جو روز کئی کئی جانوروں کو مار کر کھا جاتا تھا۔ سارے جانور پریشان تھے کہ کیا کریں۔ انہوں نے جنگل کے سارے جانوروں کا اجلاس بلایا اور غور و فکر کے بعد طے کیا کہ ہر وقت موت کے خوف میں مبتلا رہنے سے بہتر ہے کہ قرعہ کے ذریعے روز ایک جانور' جس کا نام نکلے' خود شیر کے پاس چلا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ شیر کو اس بات کی اطلاع دے دی گئی۔ روز قرعہ پڑتا اور جس کا نام نکلتا وہ از خود شیر کے پاس چلا جاتا۔ ایک دن ایک خرگوش کا نام نکلا اور وہ حسب دستور شیر کی طرف چل پڑا۔ یہ وہ خرگوش تھا جس نے اجلاس میں جب یہ فیصلہ سنا تھا تو اپنے دل میں کہا تھا کہ وہ ایسی تدبیر کرے گا جس سے شیر سے ہمیشہ کے لئے گلو خلاصی ہوجائے گی اور جب اس کی باری آئی تو اس نے تدبیر سوچ لی تھی۔ خرگوش جان بوجھ کر دو گھنٹے کی تاخیر سے شیر کے پاس پہنچا۔ شیر بھوک کے مارے غصے میں غرا رہا تھا۔ اس نے جو ننھے خرگوش کو اپنی طرف آتے دیکھا تو غصہ سے بھڑک اٹھا۔ خرگوش نے شیر کو اس حالت میں دیکھا تو عرض کیا کہ حضور! مجھے تو صبح ہی بھیج دیا گیا تھا اور مجھے ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک اور خرگوش کو بھی بھیجا گیا تھا لیکن راستے میں آپ جیسا ایک اور شیر مل گیا اور ہم پر جھپٹ پڑا۔ میں بڑی مشکل سے بچ کر آپ تک پہنچا ہوں۔ جبکہ میرے دوسرے ساتھی کو وہ مار کر کھا گیا۔ شیر یہ سن کر غصہ میں آگیا' پوچھا: وہ شیر کہاں ہے؟ خرگوش نے کہا وہاں ہے اور اس راستے پر چل پڑا۔ آگے آگے خرگوش' پیچھے پیچھے شیر۔ چلتے چلتے وہ اسے ایک کنویں پر لے آیا اور کہا حضور وہ اس کے اندر ہے۔ شیر کنویں پر آیا اور جھانکا تو دیکھا کہ ایک ویسا ہی شیر کنویں کے اندر ہے۔ اسے دیکھ کر وہ غرایا تو دیکھا کہ کنویں کا شیر بھی غرا رہا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ--- جھٹ سے کنویں میں کود گیا۔ خرگوش نے حسن تدبیر سے اس طرح سارے جنگل کو شیر سے نجات دلوا دی۔

خواتین و حضرات! یہی وہ تدبیر ہے جس کی تیرھویں صدی میں مولانا روم نے تلقین کی تھی اور یہی وہ تدبیر ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ اسی تدبیر سے ہم بیسویں صدی کے تاتاریوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا نام لے کر صرف شور مچانے سے ہم اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ تدبیر اور عمل سے' اتحاد' تفکر و تدبر سے ہم اکیسویں صدی کو اسلام کی صدی بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بصورت دیگر اکیسویں صدی ہمارے لئے ایک ہولناک صدی ہوگی۔

☆ -------- ☆

(2 جون 1992ء کو شام ہمدرد کے موقع پر راولپنڈی میں پڑھا گیا)

عالمی چمن گوشے

شیلا شوبھا

بھارت کی نامور شاعرہ شریمتی شیلا گجرال

ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ شعر کہتی ہیں۔ ان کی نظموں کے عربی اور بنگلہ زبانوں میں تراجم پر مشتمل مجموعے شام اور بنگلہ دیش میں کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تراجم شام کے ممتاز شاعر سلیمان العیسیٰ اور بنگلہ دیش کی مقبول شاعرہ نیلما ابراہیم نے کئے ہیں۔

علاوہ ازیں ان کی بہت سی نظمیں روسی زبان میں بھی منتقل ہو چکی ہیں۔ آپ کو ورلڈ آف گولڈن پوئٹری کا عالمی اعزاز

(World of Golden Poetry Award)

1989ء اور 1990ء میں دو مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔

شریمتی شیلا گجرال بھارت کے ایک سابق وزیر خارجہ جناب اندر کمار گجرال کی اہلیہ ہیں۔ "چہار سو" کو انہوں نے اپنی چند پنجابی اور انگریزی نظموں کے ترجمے عنایت فرمائے ہیں جو ہم موصوفہ کے شکریہ کے ساتھ نذر قارئین کرتے ہیں۔

جناب اندر کمار گجرال کے بارے میں یہاں یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ قیام پاکستان سے قبل آپ کا قیام جہلم میں تھا۔

(گلزار جاوید)

نظمیں

ایک سوال

دادی اماں دادی اماں
یہ گونجتی آواز
ماں کے پیٹ کی دیواریں پھلانگتی ہوئی
ہوا کے پروں پر اڑاتی ہوئی
میرے کانوں میں
آہستہ آہستہ مصری گھول رہی ہے
چھوٹے چھوٹے پتلے پتلے ہونٹوں سے
ہلکی ہلکی مسکراہٹ کی پھوار
ہزار ہا میل دور سے بھی
من کے جھروکوں میں کھیلتی
لشکارتی
ہیرے موتیوں کی آب و تاب والی
جسم کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس کی مہک
آس کی پینگ الارتی
من آنگن میں
خوشبو کے ہلے بکھیر رہی ہے
تیری بوڑھی پرانی ہڈیوں
میں سے بہتی ہوئی جوئے شیر
لاکھ امیدوں کی ایک دھار
دادی تیری پکار
مجھ تک پہنچ رہی ہے

یہ کہانیاں

یہ کہانیاں
خوشبو کے سفید پھول
بھڑکیلے چمکیلے
پل کی پل شوبھانے والے
بھاپ کی طرح اڑ جاتے ہیں
نہ دل پر کوئی دستک
نہ دماغ میں کوئی نقش

سفو

ریت میں منہ چھپائے کیوں پڑے ہو

آنکھیں کھولو اپنے واہموں کی

زنجیروں کو توڑ کر

عوام کی تڑپاتی ہوئی پکار کو دھیان سے سنو

جو وادیوں اور گھاٹیوں میں چیخ رہی ہے

ڈوبتے ادب کی سسکیاں
چاروں طرف سنسنا رہی ہیں

اے جوانانِ مشرق

اپاہجوں کی مثل

پردیسی فن و ادب کے سامنے

سہمے ہوئے بت کی طرح کیوں کھڑے ہو
بنیادی انسانی سوالات کو ٹٹولو

حقائق کو دریافت کرو۔۔۔ شناخت کرو

افکار کے اجارہ داروں کو پرکھو

پھر راستہ ملے گا
کہ راستے تو ہمت والوں کے

قدم چومنے کے لئے

ہمیشہ بے چین رہتے ہیں

نانیاں دے رسیلے قصے
سنیاں مدتیں گزر گئیں
مگر یادیں اب بھی ہری بھری ہیں
جن کے آتے ہی من کے اندر
گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو
پھیل جاتی ہے
جنگلی جھاڑیوں کی شاخوں سے
جذبوں کا گل قند بہہ نکلتا ہے
رب جانے کس راستے سے

ائرکنڈیشنڈ بند کمرے میں
شانتی اور سرور کی ایک لہر
جسم کے انگ انگ میں اترنے لگتی ہے
جی کرتا ہے
کہ سامنے رکھی نغموں سے بھری
رنگا رنگ کھٹی میٹھی نعمتوں سے بھری
چاندی کی طشتریوں کو
ٹھوکر مار کر
برگد کے گھنے پیڑ کی چھاؤں میں
چن ماہی کے ساتھ
جنگلی آم چوستے
مٹی کے مٹکے سے چلو چلو پانی پیتے
درختوں کی اوٹ میں
ٹھنڈی سبز گھاس پر لیٹ کر
عمر بھر کی تھکان اتار دیں

پنجابی

پیار کی صراحی

جب لوگ
پیار کے بہتے دریا میں
زہر گھول رہے تھے
میں نے دریا کے سرچشمے سے

پیار کی شہد و شبنم سے
اپنی صراحی بھر لی
جس کو ترسی ہوئی زمین پر

بوند بوند انڈیل رہی ہوں

سورج

ڈرے ہوئے بچے کی طرح

بادلوں کی جھالر سے جھانک کر

ہوا کے یخ تھپیڑوں سے تیورا کر

چکرا کر

وہیں جم گیا ہے

انگریزی

بلندی

بلندی پر
چڑھتے جاؤ --- چڑھتے جاؤ
افسردگی اور مایوسی کی پتھریلی چوٹیوں
گھاٹیوں کو پاٹتے جاؤ
آوارہ روح کے لئے
شانتی کا نشیمن بنانے کے لئے

دھوکہ باز

لفظوں کے ریشمی قالین پر جھولتا ہوا
وہ ماتا کے شانتی بھرے من میں اتر گیا
سرگوشیاں کرتی ہوئی لہروں کے
پروں پر اڑتا اڑتا
وہ میرے کچے کنوارے جسم میں اتر گیا
اس نے ماں کی حویلی کی سب امانتیں
لوٹ لیں
میرے دل کی چاندی سی دھڑکنوں کو
غارت کرکے
اپنی ماں دھرتی کو چھوڑ گیا

یونان کے دیہات میں

یہ رعنائیوں سے چھلکتی ہوئی وادیاں
درخت اتنے حسین ہیں
کہ پتے --- نگاہوں کے لمس سے
نارنجی ہونے لگ جاتے ہیں

لہروں سے

لہرو!
کیا تم برہم ہو
احتجاج کر رہی ہو
جھاگ اڑاتی ہوئی
گرداب چکراتی ہوئی
ان گنت مچھلیوں کے غول میں
لہرو!
کیا تم افسردہ ہو
یا --- گا رہی ہو
پنچم سروں میں
خوشی کے گیت
پرانے اور نئے
لہرو!
کیا تم
اپنی اس خوش آہنگ غنودگی میں
کچھ خواب
کچھ سوغاتیں
سمندر کے لئے، اپنے دامن میں
لئے جا رہی ہو؟

افسانہ

چھوٹی سی بات

سعید شیخ

خان صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے منہ سے نکلی چھوٹی سی بات ان کے گھر میں اتنی اہم بن جائے گی۔

عام طور پر وہ صحن کی طرف بہت کم نکلتے تھے پھر انہیں پتہ تھا اس طرف گھر کی نوکرانیاں کام کرتی رہتی تھیں۔ ان کی کوٹھی کا ٹی وی لاؤنج اس صحن میں کھلتا تھا جس کے دروازے کے سامنے ان کی نشست ہوتی تھی۔ جالی کا دروازہ اکثر بند رہتا تھا اور دروازے کے اس طرف شانو کام کرتی تھی۔ صحن کی دیواروں پر بڑی خوبصورت بیل پھیلی ہوئی تھی اور ساری دیوار کو اس نے اس طرح ڈھانپ رکھا تھا جس طرح شانو کے دوپٹے نے اس کے سینے اور قرب و جوار کو چھپا رکھا تھا۔ شانو جالی کے دروازے کے سامنے سے ضرور گزرتی تھی مگر خان صاحب کو نہ تو اس پھیلی ہوئی بیل کا پتہ تھا اور نہ ہی ان کی نظر شانو پر پڑی تھی۔ زرینہ بیگم کو البتہ ہر بات کا پتہ رہتا تھا۔ وہ بند جالی کے دروازے کے باہر کی ہر بات پر دھیان رکھتی تھی۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر کڑی آنکھ رکھتی تھی۔ جہاں بھی دیوار پر سے وہ ریشمی بیل کھسک جاتی' زرینہ خان دیوار پر کیل ٹھونک دیتی اور دھاگے سے بیل کا ڈھیلا حصہ باندھ کر کس دیتی۔ شانو کو سینے پر دوپٹہ پھیلانا اسی نے سکھایا تھا۔

خان صاحب کیلئے باہر کا منظر کوئی خاص کشش نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے تھے اور اخبار میں بھی ان کی توجہ سٹاک ایکسچینج مارکیٹ کی قیمتوں پر رہتی۔ انہوں نے کئی کمپنیوں کے حصص خرید رکھے تھے جن کے بڑھتے گھٹتے ریٹس ان کیلئے بہت اہم تھے۔ ان کے سامنے صحن کی سبز ریشمی دیوار کے اس طرف آسمان پھیلا رہتا تھا کیونکہ ان کے پچھواڑے ابھی کوئی کوٹھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ خان صاحب کے لئے اس آسمان کے بدلتے رنگوں میں کشش نہیں تھی۔

شانو اس بے کیف دھندلے منظر کا حصہ تھی جس سے علیحدہ ہونے کی خواہش اس کے دل میں ابھی تک نہیں جاگی تھی۔ کھردرے سوتے کپڑے پہنتی تھی اس نے کبھی خود پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی ممانی اسے کہا کرتی تھی۔

"کالی کلوٹی ---- کرموں جلی" اس سے زیادہ اس نے خود کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس نے جالی کے دروازے کا کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ کچن کے دروازے سے اندر آتی تھی اسے خود سے دروازے کھولنے کا شوق بھی نہیں تھا اور نہ ہی وہ ندیدوں کی طرح ادھر ادھر جھانکتی تھی۔ بس سر جھکائے اپنا کام کرتی رہتی تھی۔ جب زرینہ بیگم اسے کچن کے راستے اندر بلاتیں تو وہ آجاتی اور پھر چند منٹوں میں جھاڑ پونچھ اور غسل خانوں کی صفائی کر ڈالتی۔ جتنی دیر شانو اندر کام کرتی رہتی زرینہ بیگم زیادہ تر اس کے سر پر کھڑی اسے ہدایات دیتی رہتیں۔ انہوں نے کہہ کہہ کر شانو کو اتنی پختہ عادت ڈال دی تھی کہ کام کاج کے دوران بھی اس کا دوپٹہ اس کے سینے پر لپٹا رہتا۔ وہ خود تو اب دوپٹے کا استعمال کم ہی کرتی تھی۔ شاید ان کے دل میں کہیں یہ خیال اور خوف جاگزیں تھا کہ جوان لڑکی کتنی ہی غریب اور یتیم ہی کیوں نہ ہو اس کے سینے میں اداسیاں بھری ہوتی ہیں اور یہی اداسیاں طوفان بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ انہیں عجیب سا وہم اور دھڑکا لگا رہتا تھا حالانکہ ان کے بچے اب کافی بڑے ہوگئے تھے۔ ایک بیٹا ایم بی اے کر رہا تھا جبکہ بیٹی ایم بی بی ایس تھرڈ ایئر میں تھی۔ خود خان صاحب اپنی عمر کے اس حصے میں تھے جہاں حال اور مستقبل سے زیادہ ماضی میں جینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ پھر بھی زرینہ بیگم کی کوشش ہوتی کہ خان صاحب کے بینک سے واپس آنے تک شانو کام دھندے سے فارغ ہو کر ان کے گھر سے نکل جائے۔ شانو کو خود بھی جلدی ہوتی تھی اس کی ممانی نے اسے ایک اور گھر کی صفائی دھلائی بھی دلا رکھی تھی۔

دونوں گھروں سے پانچ پانچ سو روپے ملتے تھے۔ روٹی کپڑا اور پرانے کپڑے توفیق کے مطابق تھے۔ یہ رقم اور کپڑے شانو کی ممانی ہر مہینے خود وصول کرنے آتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی ان روپوں پر اس کا حق تھا آخر شانو کے ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے تو شانو کو پال پوس کر جوان کیا تھا۔

خان صاحب کے گھر لوٹنے تک عام طور پر شانو سارا کام نپٹا لیتی تھی۔ غسل خانوں اور بیڈ روم کا تو زرینہ بیگم بالکل وساہ نہیں کھاتی تھی وہ سمجھتی تھی کہ یہ کمرہ ان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں کسی تیسرے شخص کی موجودگی کے ٹھہرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ شانو اگر صحن میں ہوتی تو زرینہ بیگم ذرا بے فکری ہو جاتی تھی۔ خان صاحب صحن والے دروازے

کے سامنے بیٹھ جاتے تو بھی انہیں شانو نظر نہیں آتی تھی۔ شانو نظر آنے والی چیز ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو غیر شعوری طور پر دوسروں کی اور خاص طور پر مردوں کی نظروں سے دور رہنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ خان صاحب کی زندگی میں اور بہت اہم معاملات تھے۔ بینکر تھے' بڑے بڑے اکاؤنٹس ہولڈر سے ان کی پی آر تھی' ان کا پیچھا کرنا' انہیں ڈنرز پر پارٹیوں پر بلانا اور ان کے بارے میں سوچنا اور انہیں پھانسنے کی سکیمیں بنانا---- انہیں شانو پر غور کرنے کا' اسے دیکھنے کا وقت کہاں سے ملتا۔ نفع و نقصان' سود و زیاں کی زندگی گزارتے گزارتے خان صاحب ایسی حالت میں پہنچ چکے تھے کہ چھوٹی موٹی بات کا اثر بھی ان پر نہیں ہوتا تھا۔ ایسے بینکر کی زندگی میں شانو بھلا کیسے دخل اندازی کر سکتی تھی۔ اور پھر شانو کو ابھی جوان لڑکیوں کی طرح دیکھنا نہیں آیا تھا اسے خان صاحب کی نظروں میں آنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو زندگی کی ایسی اکائی تھی جو کسی بھی طرح ان کے خیال کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ خان صاحب کا احساس تو ویسے بھی دولت کی میت سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی گفتگو' ان کا اٹھنا بیٹھنا' بس دولت کے اثرات اور معاشیات تک محدود تھا پھر وہ پچاس سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ لیکن زرینہ بیگم کا خیال تھا یہ عمر بڑی نازک ہوتی ہے۔ خان صاحب کے پاس سٹیٹس' دولت' عزت سب کچھ تھا کیا پتہ کہیں اندر سے کوئی سوئی ہوئی حسرت جاگ پڑے اور ان کی زندگی پر قبضہ کر لے جبکہ آج کل کی جوان لڑکیوں کیلئے اس عمر کے دولت مند اور صاحب ثروت لوگ بہت کشش رکھتے ہیں۔ زرینہ بیگم کے نزدیک لڑکی' لڑکی ہوتی ہے وہ امیر ہو یا غریب' خوبصورت ہو یا بدصورت۔ اسے پتہ تھا کہ خان صاحب کی نظر بری نہیں تھی۔ آخر اس کی عمر گزر گئی تھی خان صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے حسرت ہوتی تھی کہ خان صاحب بھی عاشقانہ قسم کی فلمی اور بازاری گفتگو کریں۔ لیکن خان صاحب کی نظر بس ایک خاوند کی ہی نظر رہی---- مگر زرینہ بیگم کو کسی دوسرے کی نظر کا اعتبار نہیں تھا۔ خاص طور پر عورت کی نظر کی وہ خود تو اب جوان نہیں رہی تھی مگر سمجھتی تھی کہ عورت جوان ہو---- لڑکی ہو تو اس کی نظر میں تلوار کی کاٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ لوہے کا سینہ چیر سکتی ہے اسی لئے بیگم زرینہ خان صاحب کو اپنے وجود کے حصار میں لئے رہتی تھیں۔ اکثر پارٹیوں میں وہ خان صاحب کے ساتھ جاتی تھیں کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے اگر کبھی خان صاحب کو اکیلے جانا پڑتا تو ان کی واپسی پر زرینہ بیگم' خان صاحب کی آواز' ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور لباس سے کچھ سونگھنے' جاننے کی کوشش ضرور کرتیں۔ یہ سب کچھ اتنے غیر محسوساتی انداز میں ہوتا کہ خان صاحب تو کیا خود بیگم زرینہ کو بھی خبر نہ ہوتی۔

اتنے سال گزر گئے۔ اب بھی زرینہ بیگم کا مرد کے متعلق خیال تھا کہ اس کی اندر کی دنیا پوری طرح عورت پر آشکارا نہیں ہوتی۔ مرد ہمیشہ ہر عمر میں انقلاب کی زد میں ہوتا ہے۔ اور پھر ایسے عہد میں جہاں آئے دن عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں بظاہر انہیں خان صاحب پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ ان کی بہت عزت کرتی تھیں۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود زرینہ بیگم شانو کے آنے جانے' اٹھنے بیٹھنے' کام کاج' جھاڑ پونچھ کا حساب کتاب ضرور رکھتی تھیں اور جب کبھی انہیں اس حساب کتاب میں کوئی فرق یا گڑبڑ محسوس ہوتی تو وہ اس کی ممانی کو بلوا کر بات ضرور کرتیں۔ شانو اپنی ممانی کی مار پیٹ اور جھڑکیوں کی بچپن سے عادی تھی اس کی ممانی اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے اسے اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔ خاص طور پر جس دن سے اسے پتہ چلا تھا کہ اس کی ممانی نے اسے اپنے اس عزیز سے بیاہنے کا ارادہ کر لیا ہے جس کی دو بیویاں پہلے ہی فوت ہو چکی ہیں۔ اس کی خوبی یہی تھی کہ اس آدمی کی محلے میں بڑی دکان تھی جہاں سے اس کی ممانی کو ادھار اور کبھی کبھی مفت سامان مل جاتا تھا۔ شانو کام کرتے کرتے اگر کبھی سوچتی تو اس آدمی کے متعلق جو اس کی زندگی کا مالک بننے والا تھا خود کو تسلی دینے کی خاطر وہ یہی کہہ لیتی۔

"ایسی شکل کیلئے بس ایسا مرد ہی مل سکتا ہے۔"

اسے اپنا کچھ زیادہ پتہ نہیں تھا۔ کسی نے اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کیا تھی۔ ان حالات میں اس نے بھی کبھی اس گھر میں خان صاحب کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ تو اچانک ہوا۔

اس روز چھٹی تھی۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا صحن میں بادلوں کی بھیگ اتری ہوئی تھی۔ خان صاحب جالی کے دروازے کے سامنے اخبار لئے بیٹھے تھے۔ زرینہ بیگم بیڈ روم میں ڈرائیر سے گیلے بال خشک کر رہی تھیں گزری رات کا رنگ ان کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ باہر صحن میں ٹھنڈی ہوا کی لہر آئی تو دیوار سے لپٹی بیل کے پورے جسم میں سرسراہٹ تیرتی چلی گئی۔ دیوار سے اچٹتی خان صاحب کی نگاہ آسمان کی طرف گئی اور آسمان پر گھرے گھرے بادلوں میں ایسی الجھی کہ واپس نہ آ سکی۔ انہوں نے اس طرح کے بادل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اخبار قالین پر پھینک کر وہ صحن میں نکل آئے۔ آسمان پر جھومتے' تیرتے بادلوں کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ ان کی نگاہ ان بادلوں میں بھٹکتی ہوئی دیوار پر کپکپاتی بیل پر اتری اور پھر صحن میں بائیں جانب بادلوں کے سرمئی سایوں میں کھڑی شانو پر آ کر ٹک گئی۔ اس کا سانولہ چہرہ' ہلکا پھلکا جسم سب اس منظر کا حصہ تھا۔ انہیں لگا یہ

چہرہ پہلے ہی سے دیکھا ہوا ہے۔ شانو کے چہرے پر آنکھوں میں' بادلوں کا عکس تھا' ہونٹ زیادہ گلابی لگ رہے تھے' ناک چھوٹی اور ذرا چپٹی تھی' مگر ایسی کہ اس سے بہتر ناک اس چہرے کیلئے تصور نہیں کی جاسکتی تھی۔ خان صاحب کو یاد آگیا۔ ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ جلدی سے ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر بیگم کو آواز دی۔

"ارے بھئی زرینہ! ذرا ادھر تو آؤ!"

زرینہ دھلا چہرہ' گیلے بال لئے خان صاحب کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"جی! فرمایئے!!"

"بھئی! تم نے اس کا چہرہ دیکھا ہے؟"

خان صاحب نے بڑی ایکسائیٹڈ آواز میں کہا۔

"کس کے چہرے کو؟" بیگم بولی۔

"ارے بھئی! اپنی شانو کے چہرے کو؟"

خان صاحب نے بدستور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

شانو نے خان صاحب کی آنکھوں اور پھر آواز کو دیکھ سن لیا تھا وہ جالی کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

"کیوں! کیا ہوا اس کے چہرے کو؟"

زرینہ بیگم اب گھبرا گئی تھی۔

"ارے بھئی! غور سے تو دیکھو! شانو کا چہرہ بالکل اروناؔ لیلیٰ کا چہرہ ہے کتنی خوشی کی بات ہے!"

خان صاحب کی بات شانو نے بھی سنی۔ اس کا پورا جسم پہلی مرتبہ کسی نامعلوم احساس سے لرز اٹھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

زرینہ بیگم نے پوچھا۔

"میں صحن میں گیا تھا۔ بادلوں کو دیکھنے۔ وہاں میں نے تمہاری شانو کو دیکھ لیا۔ بہت ہی گہری مشابہت ہے اس کے چہرے میں۔ بھئی کمال کا چہرہ ہے حیرت کی بات ہے رنگ بھی بالکل ویسا ہی سانولا ناک تو بال جیسے اسی کی ہو۔ بس انیس بیس کا فرق ہے۔ تمہیں پتہ ہے نا! کبھی میری فیورٹ ایکٹر تھی۔"

خان صاحب بدستور خوش ہو رہے تھے۔ زرینہ بیگم کا کلیجہ اچھل رہا تھا۔ خان صاحب کا لہجہ انہیں بدلا بدلا' اجنبی لگ رہا تھا۔ ایسے لمحے جب زرینہ بیگم کے اندر کئی وسوسے سر اٹھا رہے تھے شانو کے اندر ایک نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ نئی سحر پھوٹ رہی تھی جیسے خود کو دریافت کر رہی تھی' روشنی ہوتی جارہی تھی' دیوار پر لپٹی بیل کی طرح لرز رہی تھی۔

"آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی اسے اس طرح دیکھنے کی؟ غریب یتیم کالی کلوٹی نوکرانی اور کہاں وہ بنگال کی ساحرہ؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں!"

زرینہ بیگم نے ناپسندیدگی سے کہا۔

شانو نے زرینہ بیگم کی یہ بات نہیں سنی۔ اس کیلئے تو باقی سب آوازیں جیسے خاموش ہوگئی تھیں۔ صرف خان صاحب کے الفاظ اس کے اندر کے اندھیروں میں دیوں کی طرح روشن ہوگئے تھے اس کے دل میں چاند پھیل گیا تھا۔ وہ خود کو نئے زاویئے نئی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کالی کلوٹی کی قید سے آزاد ہو کر اروناؔ لیلیٰ کی ہمزاد میں ڈھل رہی تھی۔

خان صاحب اپنی بیگم کو تسلی دے رہے تھے۔

"میں تو بادلوں کو دیکھ رہا تھا وہ اچانک میرے سامنے آگئی۔ میں نے تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"اور آج دیکھا بھی تو کس نظر سے!"

زرینہ بیگم نے ہلکی سی طنز کی۔ خان صاحب بات کی تہہ میں جانے کے عادی نہیں تھے۔ خاموشی سے صوفے پر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

اگلے دن شانو کام پر آئی تو زرینہ بیگم نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں بڑی دمک اور چہل پہل تھی۔ یوں رنگ و روپ نکل آیا تھا جیسے کہیں شب عروسی گزار کر آئی ہو۔

اس نے کپڑے بھی رنگین پہن لئے تھے اس کی آنکھیں کھلی کھلی تازہ لگ رہی تھیں جیسے رات بھر خواب دیکھ رہی تھیں دوپٹے میں کئی رنگ تھے۔

آج خان صاحب بھی خلاف معمول جلدی آگئے تھے۔ شانو ابھی تک کوٹھی میں ہی تھی۔ شانو بار بار جالی کے دروازے تک آتی تھی۔ خان صاحب اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ شانو کا جی مچل رہا تھا کہ خان صاحب پھر اسے دیکھیں۔ کل والی نظر سے اور پھر کوئی بات کریں اس کے متعلق' اس کے چہرے' اس کی ناک کے متعلق' مگر آج شیئر مارکیٹ میں بہت تبدیلی ہوئی تھی۔ خان صاحب بہت توجہ سے حصص کے ریٹ پڑھ رہے تھے۔ آج ویسے بھی بادل نہیں آئے تھے۔ شانو اور کل کو بھول چکے تھے مگر شانو کی کل ہی تو آج تھا۔

وہ روزانہ اسی طرح صاف ستھری بن کر آنے لگی۔ دن بدن اس کا چہرہ نکھرتا جارہا تھا۔ زرینہ بیگم پریشان تھیں' کئی مرتبہ تو انہوں نے شانو کو کام چھڑا کر واپس بھیج دیا۔ چند روز بعد شانو نے دوسرے گھر کا کام چھوڑ دیا۔ وہ زیادہ دیر اسی گھر میں رہنا چاہتی تھی۔ یہیں خان صاحب کی نگاہ میں ان کی

چاکری میں، کیونکہ انہوں نے ہی تو اسے اپنی شناخت دی تھی، اپنا شعور دیا تھا۔ اتنے بڑے آدمی نے اس کی ذات کی گواہی دی تھی۔ وہ تو خان صاحب کی احسان مند تھی، ان کی شکر گزار تھی۔ اسے اب کوئی اور شہادت نہیں چاہئے تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ خان صاحب پھر سے کہیں اسے جوش بھرے لہجے میں۔

"دیکھو بھئی! یہ شانو --- اس کی شکل تو ہو بہو اروناؔ لیلیٰ سے ملتی ہے۔"

اس نے کوٹھیوں میں کام کرتے ہوئے ٹیلی ویژن پر اروناؔ لیلیٰ کو گاتے دیکھا تھا۔ وہ اروناؔ لیلیٰ کو جانتی تھی اور اب اسی حوالے سے اس نے خود کو جان لیا تھا۔

جب اس نے دوسری کوٹھی کا کام چھوڑا تو زرینہ بیگم نے اسے کہا۔

"شانو! میں تمہیں پانچ سو روپے سے زیادہ تنخواہ نہیں دوں گی۔ تم نے میرے کہنے سے تو اس گھر کا کام نہیں چھوڑا؟"

حالانکہ شروع شروع میں زرینہ بیگم نے اسے آٹھ سو روپے ماہوار کی پیشکش کی تھی اگر وہ دوسرے گھر کا کام چھوڑ دے۔ شانو کے کام میں اب صفائی آگئی تھی۔ مگر اب بات دوسری تھی اگرچہ شانو نے زرینہ بیگم کو کم کوس بنا دیا تھا۔ وہ شانو کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اچھی نوکرانیاں آج کل کہاں ملتی ہیں پھر شانو نے تو اس گھر کا سارا کام سنبھال رکھا تھا۔ اب تو اس کا جی چاہتا تھا بیگم صاحب باورچی خانے کا بھی سارا کام اسے سونپ دیں۔ اسے خان صاحب کے گھر سے خاص انس ہوگیا تھا۔

جب زرینہ بیگم نے اسے کہا کہ پانچ سو روپوں سے زیادہ نہیں ملیں گے تو شانو مسکرا دی، ہنس دی۔ اسے اب پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔

زرینہ بیگم نے دیکھا۔ یہ ہنسی، یہ مسکراہٹ، آنکھوں کی یہ چمک معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ انہیں لگا اس ہنسی کے پیچھے کوئی مقصد تھا ورنہ کون ایسا غریب ہوگا جو اس طرح پیسوں سے بے نیاز ہوجائے۔ یہ مقصد کیا ہوسکتا ہے؟

زرینہ بیگم نے سوچنے کی کوشش کی۔

وہ شانو کو چھٹی بھی نہیں دے سکتی تھیں، خانساماں بوڑھا تھا، بیمار تھا، اور بیٹی خود میڈیکل میں تھی گھر کا کام کاج نہیں کرسکتی تھی۔ شانو تو اب بہت توجہ، محنت سے کام کرنے لگی تھی۔ اسے کام میں مزہ آنے لگا تھا اچھی بات تو یہ تھی کہ اب وہ پانچ سو روپے کا کام نہیں کرتی تھی وہ تو یہ سب کام خان صاحب کے تعلق سے کرتی تھی۔

اس کی ممانی نے اسے سمجھایا تھا۔

"دیکھ شانو! زیادہ جان مارنے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کام جتنے یہ لوگ پیسے دیتے ہیں۔"

مگر اب شانو کو اپنی ممانی کی کوئی بات یاد نہیں تھی۔ خان صاحب کے گھر آکر تو اسے اپنی ممانی یاد ہی نہیں رہتی تھی۔ جھاڑ پونچھ کرتے سے اب اس کی بانہوں میں چوڑیاں چھنکنے لگی تھیں وہ اکیلے میں گنگنانے لگی تھی۔

زرینہ بیگم نے اس کی ممانی کو بلوایا اور کہا۔

"حمیدہ! اسے سنبھالو!! ورنہ ہاتھ سے نکل جائے گی!"

"میں کیا کروں بیگم صاحب جی! پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے شیشے میں دیکھتی رہتی ہے گنگناتی ہے۔ میری تو بات اب اسے سنائی نہیں دیتی۔" حمیدہ نے اپنی پریشانی ظاہر کی تو زرینہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔

"اب تو کپڑے بھی بہت اچھے پہن کر آتی ہے۔"

زرینہ بیگم سوچتے ہوئے بولی۔

"یہی نہیں بیگم صاحب جی! دھڑلے سے کہہ دیا ہے فقیرے سے شادی نہیں کرے گی میں نے غصے میں آکر اگلے روز اس پر ہاتھ اٹھایا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر کہنے لگی "بس مائی! بہت ہوگیا۔ اب میں مار نہیں کھاؤں گی" میں تو اس کے تیوروں سے ڈر گئی۔"

شانو کی ممانی کی باتوں نے زرینہ بیگم کے دماغ کے وسوسوں کو اور شہہ دی۔ انہیں لگا جیسے شانو کے ارادے اب اچھے نہیں تھے۔ جبھی تو وہ کام کرتے کرتے بیگم کا ہاتھ بٹاتی اور موقع بے موقع خان صاحب کا ذکر کرنے لگتی۔ وہ کہاں کام کرتے ہیں، کس وقت سوتے ہیں، مسکراتے کیسے لگتے ہیں، کتنے اچھے ہیں، کتنا خیال رکھتے ہیں۔

شانو اس دوران موقع پاکر کئی دفعہ جالی کے دروازے کے سامنے سے رنگ اڑاتی گزرتی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اندر چلی آتی۔ اب اس نے ٹی وی لاؤنج کا سامنے والا دروازہ بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا مگر خان صاحب تو جیسے شانو کو بھول چکے تھے۔ شانو باوجود کوشش کے انہیں نظر نہ آسکی۔ انہوں نے نظر ہی نہیں اٹھائی۔ زرینہ بیگم اس کی تمام حرکات کا جائزہ لیتی رہتی تھیں۔

شانو تو ان چند الفاظ چند فقروں کی بازگشت کے ساتھ بندھی تھی جو خان صاحب نے بادلوں والے دن ادا کئے تھے۔ اب تو دھوپ مسلسل پڑنے لگی تھی۔ بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ شانو تو خان صاحب کی یادداشت کو ترغیب دلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی وہ پھر کسی کی زبان سے اپنے

متعلق سننا چاہتی تھی۔

یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔

زرینہ بیگم نے ان گرمیوں میں اپنی بہن کے پاس امریکہ جانے کا پروگرام بھی ملتوی کر دیا۔ انہیں تو اپنے گھر کی فکر لگ گئی تھی۔ کون جانے کہ--- خان صاحب کے دل میں چنگاری سلگ کر شعلہ بن جائے۔ وہ اچھے خاوند تھے' اچھے شریف باپ تھے مگر ایک مرد بھی تھے' مرد جس کی ساری دنیا کبھی بھی عورت کی نظر میں نہیں آتی' جو کبھی بھی' کسی بھی انقلاب کی زد میں آسکتا ہے۔

زرینہ بیگم کو اپنا آرام' اپنی سہولت عزیز تھی اسی لئے انہوں نے ابھی تک شانو کو جواب نہیں دیا تھا۔ اب تو وہ ان کے بیڈ روم میں داخل ہوتی تو کسی نہ کسی بہانے دیر تک وہاں ٹھہری رہتی جیسے اس کمرے کی فضا میں سے خان صاحب کی خوشبو سونگھ رہی ہو۔ اکثر آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو خود میں محو ہو جاتی۔ بھول جاتی اردگرد سے بے نیاز ہو جاتی۔

اس کا کالا رنگ عجیب چمک دینے لگا تھا۔ جیسے اس کے اندر ہی اندر کہیں کوئی گلال کھل رہا ہو۔

آخر زرینہ بیگم کی برداشت جواب دے گئی انہوں نے ایک دن شانو کی ممانی کو بلوا بھیجا۔

ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا پھر بھی پانچ سو روپے اس کے ہاتھ میں رکھے شانو کا بازو پکڑ کر اس کے ہاتھ میں تھمایا اور نوکری سے نکال دیا۔

اگلے دن چھٹی تھی۔

زرینہ بیگم خان صاحب کے پاس بیٹھنے کی بجائے گھر کے کام کاج میں مصروف نظر آئیں تو خان صاحب کو تعجب ہوا اور ساتھ ہی انہیں شانو یاد آگئی۔

"ارے بھئی! کدھر گئی وہ تمہاری اردو لیلی؟ کیا نام تھا اس کا"

یہی تو وہ فقرہ تھا--- چھوٹی سی بات جس کیلئے شانو ترستی گئی تھی۔

"میں نے شانو کو نوکری سے نکال دیا ہے۔"

زرینہ بیگم نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ارے بھئی کیوں؟"

خان صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس نے پتہ نہیں خود کو کیا شے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔"

زرینہ بیگم نے سبزی کاٹتے ہوئے کہا۔ اس نے ساری بات کرنے سے پرہیز کیا۔

"اتنی چھوٹی سی بات پہ نکال دیا اسے؟"

خان صاحب نے اخبار کا اگلا صفحہ کھولتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی سی بات! ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اچھے بھلے گھر اجڑ جاتے ہیں۔"

زرینہ بیگم نے اپنی طرف سے بڑی سمجھ کی بات کی مگر خان صاحب نے پوری توجہ سے یہ بات نہیں سنی اور شیئر مارکیٹ کے ریٹ پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

غسل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جتنی دیر تک غسل کرنے والا غسل خانہ میں ہمہ تن مصروف رہے' لوگ اس کے شر سے اور وہ لوگوں کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ غسل کرنے کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ متعدد حیرت انگیز سائنسی انکشافات دوران غسل ہی ہوئے تھے مثلاً اگر ارشمیدس جسم کی کثافت کو دور کرنے کیلئے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں بیٹھ کر غسل کرنے کی عادت میں مبتلا نہ ہوتا تو آج ہم آپ نہ صرف "نظریہ کثافت" بلکہ بعد میں آنے والے "نظریہ اضافیت" سے بھی محروم رہتے' پھر یہ کہ ارشمیدس کا عالم برہنگی میں "یوریکا یوریکا!" پکارتے ہوئے سرپٹ دوڑ اٹھنا غسل پانی کے قرینے سے کچھ اس طرح چپک گیا ہے کہ اب ہمیں غسل خانوں کو یوریکا کا نام دینے میں بھی ہچکچاہٹ نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری طرف مغربی دنیا میں سمندر کنارے غسل آبی اور غسل آفتابی کے دوران بیشتر چاکان ساحل کا آپس میں کھل کھیلنا ایک اعتبار سے ارشمیدس کی قائم کردہ روایت ہی کا برہنہ تن ثبوت ہے' البتہ دونوں میں فرق ضرور ہے کہ ارشمیدس نے تو کچھ "پالیا" تھا جس کے شدید دباؤ میں آکر وہ برہنہ تن ہی روم کی گلیوں میں دوڑنے لگا تھا' جبکہ مغربی تہذیب نے کچھ "کھو" دیا ہے جسے شاید وہ ننگی ہوکر دوبارہ حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ انتہا یہ کہ عہد حاضر کا فلسفی یا سائنس دان جب کسی گنجلک سوال کا جواب ڈھونڈنے کا قصد کرلیتا ہے تو سیدھا غسل خانہ کی راہ پکڑتا ہے اور وہاں جاکر ٹب میں لیٹ جاتا ہے تاکہ غیبی اشارہ پاتے ہی گمشدہ کڑی کو ڈھونڈ نکالے۔ یوں بھی مغربی ملکوں میں باتھ ٹب کو بساط کے مرکزی مہرے کا مقام حاصل ہے اور اس کی مقبولیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ اس کے اندر نظریہ ارتقاء بھی موجزن ہے وہ یوں کہ ابتدا ہر طرف پانی ہی پانی تھا' لہٰذا زندگی کا بیج بھی سب سے پہلے سمندر کے بیکراں ٹب میں ڈالا گیا۔ اس لئے تو اسے زندگی کی جنم بھومی بھی کہا جاتا ہے اور مچھلی جو ہمہ وقت حالت غسل میں رہتی ہے جب اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ خاکی مخلوق کی مادر مہربان ہے تو ہمیں گھٹنوں پانی کے ٹب میں ہاتھ پاؤں مارنے کی انسانی حکمت عملی بھی پوری طرح سمجھ میں آگئی۔ ویسے بھی آدمی کے جسم میں نہ صرف ستر فی صد پانی بھرا ہوا ہے بلکہ جدید ترین تحقیق کے مطابق اس کے مغز میں بھی بھس کے بجائے آبی مادے کی حکمرانی ہے' چنانچہ اس سچائی کو مان لینے کے سوا دوسرا کوئی اور راستہ باقی نہیں رہتا کہ حضرت انسان واقعی پانی کا بلبلہ ہے' چنانچہ اہل مغرب کا سمندر کنارے غسل نمائی میں مشغول رہنا' پانی سے ان کے اسی قدیم نسلی رابطے کا نتیجہ ہے۔ قرائن سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مغربی طرز کے غسل خانہ میں براجمان باتھ ٹب خود انحصاری کی عملی تفسیر بنتا جارہا ہے اور مغربی فلموں میں باتھ روم اور خاص طور پر باتھ ٹب کو حجلہ عروسی کا مقام حاصل ہوچکا ہے۔ اور تو اور وہاں کے نجی غسل خانوں میں دنیا بھر کی "ٹیلی" سہولیات مثلاً ٹیلکم پاؤڈر' ٹیلی فون' ٹیلی ویژن حتیٰ کہ ٹیلی پیتھی تک مہیا کردی گئی ہیں گویا امریکی غسل خانہ ایک ایسی خودکفیل اکائی بن چکا ہے جہاں پر ریٹائرڈ شخص اپنی بچی کھچی عمر عزیز ایک مثالی انداز سے اپنی "نصف کہتر" کے ساتھ گزار سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہاں پلنگ بھی منا سکتا ہے اور چلہ بھی کاٹ سکتا ہے۔

مغرب کے عوامی غسل خانے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر پاؤں رکھتے ہی عمر' مرتبے اور ذات پات کی کوئی حدبندی باقی نہیں رہتی' اس اعتبار سے یہ غسل خانہ طبقاتی ناہمواری اور عدم مطابقت کا زبردست مخالف معلوم ہونے لگتا ہے' اپنی اس خاصیت کی بناء پر وہ عوام میں عوامی لیڈر کی طرح مقبول رہتا ہے۔ یوں بھی جس حمام میں سارے ہی ننگے ہوں وہاں اونچ نیچ کا سارا میل کچیل آپ ہی آپ دھلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر غسل خانہ شہ زوری پر اتر آئے تو نامی گرامی ثابت قدموں کے پاؤں تلے سے بھی فرش نکال دیتا ہے اور وہ دیار غسل خانہ میں ڈھیر ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا دانا لوگ غسل کرتے وقت صابن بھی پھونک پھونک کر ملتے ہیں بلکہ ماضی بعید کی ورق گردانی کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی بڑی سلطنتوں میں پروان چڑھنے والی چھوٹی بڑی سازشوں کا بہترین ٹھکانہ شاہی حمام خانہ ہی ہوا کرتا ہے کیونکہ وہاں سازشیوں کو تخلیہ کی سہولیات عام طور سے میسر ہوتی تھیں۔ گفتگو کی اس ڈور کو تھام کر آگے چلیں تو مزید کھلے گا کہ کچھ صاحبان اپنے جسم کو گدڑی کا لعل جان کر سینت سینت کر رکھتے ہیں اور بامر مجبوری ہی اسے باہر کی ہوا لگنے دیتے ہیں حتیٰ کہ پانی بھی خود پر یوں ڈر ڈر کر انڈیلتے ہیں جیسے آب گزیدہ ہوں اور جسم پر صابن ملتے ہوئے تو باقاعدہ

خود اذیتی میں مبتلا نظر آنے لگتے ہیں' البتہ کچھ ملا لوگ غسل خانے کو بے حیائی کا اڈہ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا یہ فرمانا ہے کہ خود کو سرتاپا برہنہ حالت میں دیکھنا ایک مخرب الاخلاق حرکت ہے' چنانچہ کیوں نہ حفظ ماتقدم کے طور پر آنکھیں میچ کر غسل کرنے کی عادت ڈالی جائے' بصورت دیگر کپڑوں سمیت ہی یہ فریضہ آب و بجگ انجام دیا جائے اور ایسے بھی لوگ اس دنیائے غسل گاہ میں موجود ہیں جو غسل کے دوران پورے جسم کو یوں تختہ مشق بناتے ہیں جیسے میل کچیل کی "رو سیاہی" کا بھوت اتارنے کیلئے خود سے ہاتھا پائی میں مصروف ہوں۔ دوسری طرف سطح سمندر سے دس پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر بسنے والے بعض پہاڑی قبائل' غسل کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک دو طرح کا غسل ہی جائز ٹھہرتا ہے۔ ایک وہ جو اس جہان آب و گل میں قدم رکھنے کے فوراً بعد دیا جاتا ہے دوسرا جو غسل خانوں سے بھری پری اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد واجب الادا ہوجاتا ہے۔ ان دو حالتوں کے ماسوا بقائمی ہوش و حواس غسل لینے دینے کی کوئی تیسری کوشش کر بیٹھنا ان کے تئیں ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ تاہم بعض معتقدین غسل اس آس پر بڑی باقاعدگی کے ساتھ غسل آشنا ہوتے رہتے ہیں کہ شاید کسی نیک گھڑی میں مل مل کر نہاتے ہوئے وہ کندن بن جائیں' مطلب یہ کہ نہا نہا کر نہال ہوجانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن بعض مخالفین غسل بلاناغہ غسل کرنے کے شوق کو آہستہ خرام خودکشی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر استعمال کرنے سے اشیاء گھس کر اپنی نفاست' ملائمت اور پائیداری سے ہنکدوش ہوسکتی ہیں تو بدن بھی آخر بدن ہے وہ بھی روز روز کی رگڑائی سے گھس سکتا ہے۔ خدانخواستہ یہ کوئی جھوٹا برتن تو ہے نہیں کہ اسے باقاعدگی سے دھویا کھنگالا جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر ذرا محتاط قسم کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک پڑھا لکھا معقول یا نامعقول شخص اپنی پچاس پچپن سال کی زندگی میں کم از کم ایک ڈیڑھ ٹن صابن اور شیمپو اور کئی کلوگرام خوشبودار تیل اور سینکڑوں ٹن پانی ضائع کردیتا ہے حالانکہ پانی پینے کی چیز ہے نہ کہ نہانے کی' پھر یہ کہ ان جملہ لوازمات صفائی و دھلائی پر روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے جس سے پورے ملک کو غسل آخر دینے کی نوبت بھی آسکتی ہے اور آخر میں حاصل وصول بھی کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس مارا ماری سے جسم اور ضمیر کی ہیت کذائی میں کوئی بہتری کے آثار نمودار ہوپاتے ہیں۔ یہ ناصحانہ موشگافی سر آنکھوں پر لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ غسل کرنا ایک تہذیبی عمل ہے' کیونکہ دنیا کے اس سپر غسل خانہ میں داخل ہونے کے فوراً ہی بعد حضرت انسان کو غسل دیئے جانے کے جاں گسل لمحے سے نہ چاہتے ہوئے بھی گزرنا پڑتا ہے اور اسی نیک ساعت سے غسل کی یہ عادت اس کی گھٹی میں بڑے التزام سے انڈیلی جاتی ہے تاکہ وہ آنے والی نسلوں کو زیادہ منظم طریق پر پرخوگر غسل کرسکے۔ آپس کی بات ہے انسان نے اپنی بیس ہزار سالہ نیم تہذیبی اور پانچ ہزار سالہ تہذیبی زندگی گنوا کر غسل کرنا کرانا ہی تو سیکھا ہے۔ جبکہ مادر فطرت بھی وقتاً فوقتاً تمام جمادات' نباتات اور حیوانات کو بارش کے ذریعے غسل دیتی رہتی ہے۔ یہ فطری انداز غسل وہی ہے جس سے گزر کر سارے مظاہر فطرت جھومنے لگتے ہیں لیکن ابتداً جب بارش' پیڑ پودوں کے گرد و غبار سے اٹے بدن دھونے لگتی ہے تو وہ اس کے ہاتھوں سے نکلنے کی سعی کرتے ہیں مگر جب زبردستی نہلا دیئے جاتے ہیں تو خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ ایک بالکل دوسرے طریق سے دریا اپنی لہروں سے زمین کو غسل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ سمندر تو کسی غصیلی آیا کے انداز میں مل مل کر ساحل کا بدن دھوتا رہتا ہے۔ اس کے متوازی انسانی بچے کا عین وقت غسل والدہ محترمہ کے ہاتھوں سے صابن کی چکنی ڈلی کے مانند پھدک کر نکل جانا' شرارت یا ضد کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ اس کارروائی کا لب لباب یہ ہے کہ بچہ بہ حیثیت ایک باغی' تہذیب کی "جراثیم کش" حکمت عملی کا مذاق اڑانا چاہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ آخر میں خود بھی ایک گول مٹول آنسو بن جاتا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ غسل کرنا تہذیب یافتہ ہونے کا کریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے بعد وہ ان تمام غلاظتوں اور حماقتوں میں لتھڑ جاتا ہے جو تہذیب جدید و قدیم کے نام پر اس کا اوڑھنا بچھونا بن چکی ہیں اور جن سے وہ اپنی جان چھڑانے کے ہزار جتن کرے اس کی جان مشکل ہی سے چھوٹ پاتی ہے۔ شاید یہی وہ انمول "سوغات" ہے جس کے حصول کیلئے آدمی صدیوں سے اپنے ہم نسلوں کو خون کا غسل دیتا آیا ہے۔

دیکھا جائے تو خود جسم بھی اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت خود کو غسل دیتا ہے' لیکن اس کا خود کو ایڑی سے چوٹی تک شرابور کرنے اور اپنے جیسوں کو شرم سے پانی پانی کر دینے کے مقاصد میں بڑا فرق ہے۔ جسم تو خود کو فاسد مادوں سے نجات دلانے کیلئے غسل دیتا ہے تاکہ ذہن کے فاسد مادے بھی دھل جائیں اور دل و دماغ کے سرتال میں بھی ہم آہنگی پیدا ہوجائے اور اگر بدقسمتی سے کسی بیماری کے جراثیم جسم پر بلہ بول دیں تو غنیم کی سرکوبی کیلئے اس کا پارہ تیزی سے چڑھنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور بعض دفعہ اس معرکہ آرائی میں ایک خطرناک موڑ ایسا بھی آجاتا ہے کہ چھلکتے ہوئے بدن کے قہر کو گھٹانے کی اشد ضرورت آن پڑتی ہے' لامحالہ اس موڑ پر اسے غسل دینا لازم ہوجاتا ہے کہ کہیں غیور جسم کی سپاہ میدان کارزار میں خود اپنے ہی ہاتھوں تلے کچلی نہ

جائیں؛ لیکن کبھی کبھی ان حالات میں غسل کرانا اسے غسل میت کے قریب تر بھی کر دیتا ہے' البتہ بعض لوگ معاملات دنیا میں اس تن دہی سے مشغول ہوتے ہیں کہ انھیں خود سے تنہائی میں ملاقات کرنے کا موقع غسل خانے میں ہی ملتا ہے' چنانچہ وہ وہاں اپنے بدن سے خوب گھل مل جاتے ہیں۔ بہرحال غسل خانہ میں تندی غسل کا مظاہرہ کرنا دراصل بغیر غسل کے پہاڑوں کے غاروں میں ضائع ہوجانے والے لاکھوں برسوں کی تلافی کرنا ہے اور آج کہ غسل بالی کے نت نئے آبی مواقع پیدا ہوچکے ہیں تو لوگ بھی ہاتھ دھو کر اپنے جسموں کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر غسل کرنے کیلئے اٹھ دوڑتے ہیں' تاہم غسل کرنے کیلئے غسل خانہ کا وجود ضروری نہیں ہے کیونکہ غسل تو ہینڈ پمپ کے دست شفقت' کنویں کی دھار کی آبشار اور نہر کے سیل رواں میں بھی بے خوف و خطر ادا کیا جاسکتا ہے مگر لالہ جی کے روایتی طریق اشنان کا تو جواب نہیں کہ کس طرح موصوف سردیوں میں پو پھٹتے ہی دریا کنارے پہنچ جاتے اور پھر لٹیا میں پانی بھر کر اس زاویئے سے اسے منڈھے ہوئے سر پر انڈیلتے کہ پانی کی دھار کی زد میں آنے سے پہلے ہی رام رام کرتے آگے کو نکل جاتے۔ یہ عمل وہ کم از کم تین مرتبہ دہراتے' ایسے میں نشانہ چوک جانے پر یا حسن اتفاق سے پانی کی دو چار اچٹتی چھینٹیں بدن سے چھو جاتیں تو انہیں احتیاط سے پونچھ کر غسل کی تکمیل کا اعلان کردیتے۔ ہم اس ڈھب کے غسل کو باآسانی غسل کی پیروڈی قرار دے سکتے ہیں۔

زمانہ حاضر میں غسل خانہ کی تہذیب پورے جوبن پر ہے۔ اب تو گھر کے دیگر کمروں کی آرائش پر اتنا خرچ نہیں کیا جاتا جتنا کہ فقط ایک غسل خانہ کی آب و تاب کو قائم رکھنے پر بہا دیا جاتا ہے' چنانچہ اگر کوئی نیا مکان خریدنا چاہے تو وہ مکان کا مول تول کرنے سے قبل سیدھا اس کے غسل خانہ کا رخ کرتا ہے اور کسی حاذق طبیب کی طرح غسل خانہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر باقی ماندہ مکان کی حرارت غریزی کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ علاوہ ازیں غسل خانہ کو جدید ترین ظلیاتی کیل کانٹے سے اس طور لیس کیا جاچکا ہے کہ سو سال قبل کا کوئی بدقسمت دوبارہ زندہ ہوجائے تو موجودہ غسل خانوں کو عقوبت خانے جان کر مارے خوف کے دوبارہ وفات پاجائے۔ گزارش یہ ہے کہ فارغ البال گھرانوں میں غسل خانہ امارت پرستی کا نمائندہ بن کر مکان پر غاصبانہ قبضہ جماتا جا رہا ہے' خاص طور پر ٹیلی ویژن کے اشتہارات میں تو غسل خانے داد غسل دینے کیلئے ہی پیش کئے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر قیمتی سازو سامان نصب کرنے کی صلائے عام دی جاتی ہے اور ناظر کا دل ناتواں اس قدر بھرا دیا جاتا ہے کہ اس پر دل کا دورہ بھی پڑ سکتا ہے اور شاید وہ وقت اب زیادہ دور نہیں رہا جب پورا مکان ایک چھچھاتے ہوئے غسل خانہ میں تبدیل ہوجائے گا اور صاحب خانہ ملاقاتیوں کو مہمان خانہ میں بٹھانے کے بجائے غسل خانوں میں بٹھانا زیادہ شریفانہ فعل خیال کرنے لگیں گے تاہم بہ حیثیت مجموعی آج کی نسل کو غسل یافتہ بروزن ڈگری یافتہ کہا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ کہ ادھر کچھ عرصہ سے تیسری دنیا کے اندر ایک چوتھی دنیا بھی ابھر آئی ہے جو غسل خانہ کی اجارہ داری کو تسلیم کرتی ہے' لیکن تاحال اس کے یہاں زیادہ تر بے چھت کے غسل خانوں ہی کا چلن ہے جو دریاؤں' نہروں' تالابوں اور جھیلوں کی صورت خیمہ زن ہیں' یہ ایک نوع کے اجتماعی گھاٹ ہیں جہاں ہماری ستر فیصد دیہاتی مخلوق کو گائیوں بھینسوں کی معیت میں نہاتے دھوتے ہوئے باآسانی دیکھا جاسکتا ہے البتہ نوجوانوں کا دریا میں بے دھڑک کود پڑنا اور بعد ازاں کسی غوطہ خور پارٹی یا مچھیروں کی مدد سے ان کے غرقاب وجود کو سطح آب پر لانا' مہم جوئی کی ایک شکل ہے نہ کہ غسل جوئی کی۔ دیہاتی عورت کی مثالی بعض سند یافتہ حضرات بڑے التزام سے پیش کرتے ہیں کہ وہ نہر کی پٹڑی پر بیٹھی کپڑے دھوتی' بچوں کو نچوڑتی اور خود کو سلاتی سکھاتی نظر آجاتی ہے حالانکہ یہ ثلیثی عمل' غسل بالی کی حدود میں نہیں آتا بلکہ شہری ناظر کی ضعف بصارت کا آئینہ دار ہے' کیونکہ ایک شہری بابو جس کے لئے دو عدد عینکوں کو سنبھالنا بھی مشکل ہے اس کی رائے پر توجہ دینا محض تضیع اوقات ہے۔ دوسری طرف بے چھت کے اجتماعی غسل خانوں کے متوازی' ذاتی غسل خانہ کا شہود پر آنا انفرادیت پسندی کی دلیل ہے۔ سو کسی کے ذاتی معاملات کے علاوہ اس کے ذاتی غسل خانے میں جھانکنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے' البتہ بھرے پرے گھرانوں میں معتوب و مظلوم اکلوتا غسل خانہ خاندان بھر کی ایکتا کا مظہر ہوتا ہے' بطور خاص اپنی باری پر غسل خانہ کا منہ دیکھنے کے بجائے گھر کے کسی دوسرے فرد کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع بخش دینے سے بزرگوں کا احترام' چھوٹوں سے حسن سلوک اور ہم عمروں سے رواداری برتنے کے چلن کو تقویت بھی پہنچتی رہتی ہے۔

اگر ہم نہانے دھونے کے وظائف سے وقت نکال کر "غسلیات" کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کئی راگوں اور راگنیوں کی پیدائش لحہ غسل آبی کے دوران ہوئی تھی' وہ یوں کہ جب خدام ادب ٹھنڈے برف پانی کی دھار بطور سزا زیر عتاب شاہی گویئے کے سر پر گراتے تو اس کے نرخرے سے ایک ایسی یخ بستہ آواز برآمد ہوتی جو فوراً کسی نہ کسی راگنی میں منتقل ہوجاتی۔ اسی روایت کے تحت لوگ باگ غسل خانہ میں گنگنانے اور گانے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ بچے خوفزدہ ہوکر رونے نہ

لگیں اور محلہ دار یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ ہمسائے میں مرگ ہو گئی ہے--- بلکہ پرانے وقتوں میں تو بادشاہ سلامت کے حکم پر امراء و روساء کو پانی سے بھرے حوض میں غسل دینے کا رواج عام تھا اور اس خدمت کی بجاء آوری کیلئے لونڈیوں' حبشی غلاموں اور خواجہ سراؤں کا ایک پورا بحری بیڑا ہمہ وقت موجود ہوتا تھا جو بعض اوقات اشارہ پاتے ہی --- ناپسندیدہ شخصیت کو حوض برد کر دیتا تھا۔ ہر چند کہ زمانہ حوض کی جگہ سومنگ پول نے لے لی ہے مگر اب چونکہ جمہوریت نے چھینٹے اڑانے شروع کر دیئے ہیں سو رائے عامہ ہی حاکم وقت کو ڈبونے کیلئے کافی و شافی ہے۔ تاہم غسل خانوں سے آباد اس خاک آلود دنیا میں غسل کرنا شاید اس لئے بھی زور پکڑ چکا ہے کہ لوگوں کی اکثریت کے ضمیروں میں کثافت کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے' لہٰذا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد طریق یہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ غسل فرماتے رہیں' اسی طرح بعض قبائل میں ایسی رسوم آج بھی موجود ہیں کہ جن کے مطابق رت بدلنے پر قبیلے والے ایک دوسرے پر پانی چھینکتے ہیں۔ "ہولی" کی رسم اسی اجتماعی نسل بندی کی باقیات میں سے ہے' ویسے غسل کے بعد بوجھل سے بوجھل آدمی بھی خود کو وقتی طور پر ہوا کے جھونکے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے مگر فی زمانہ غسل کرنا جنگل کی آگ کی طرح اس تیزی سے پھیل رہا ہے کہ اب صرف وہی حکومتیں معتبر قرار پاتی ہیں جو اپنے عوام کیلئے زیادہ سے زیادہ غسل و غسلیات کی سہولیات فراہم کر سکیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی ملک کی معیشت کی ترقی کا اندازہ کرنا ہو تو اس کی درآمدات و برآمدات کی فہرست کو جانچنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے آپ بس صرف اس کے غسل خانوں کی گنتی کر لیا کریں کیونکہ غسل خانوں کی تعداد سے کسی ملک کے معیار زندگی کا بخوبی علم ہو سکتا ہے اور تو اور پبلک غسل خانوں کے در و دیوار پر بکھرے کھدے خیال افروز "نقوش و نگار" اور "اقوال زریں" کے مطالعہ سے اس ملک کے باشندوں کے طبائع نفاست اور نجاست کا بھی پتہ چل جاتا ہے' چنانچہ یہ مان لینے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ غسل خانہ ہر ملک کی ثقافت کا سمبل ہے' علاوہ ازیں وہ قوموں کے ثقافتی ارتقاء کی داستان بھی پیش کرتا ہے مثلاً کون نہیں جانتا کہ مغرب والے جب تک غسل سے بدکتے رہے ان کی ترقی کی رفتار بھی سست رہی لیکن جیسے ہی انہوں نے غسل خانوں کو رونق بخشنا شروع کی تو بدن کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان کی یبوست بھی دھل گئی اور وہ میل کچیل کی تہوں سے آزاد ہو کر ایسے چمکے کہ آج نہ صرف ساری دنیا میں انہیں کا صابن شیمپو اور تیل چل رہا ہے بلکہ پوری دنیا ان کے نقوش پا پر چلنے کی آرزومند دکھائی دیتی ہے۔ بہرکیف غسل کرنے کے فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ ان پر ایک مبسوط تحقیقی مقالہ بعنوان "غسل و غسلیات" قلمبند کیا جا سکتا ہے لیکن تاحال محققین نے اس پر توجہ مبذول نہیں کی ہے ہو سکتا ہے انہوں نے یہ فرض کر رکھا ہو کہ گانا' رونا اور نہانا کسے نہیں آتا' حالانکہ سر میں گانا' سر میں رونا اور سر میں نہانا ہی تو کمال فن ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ غسل کرنا صرف جسم کو باوضو کرنا نہیں ہے' ایک عمدہ شعر سن کر' ایک خوبصورت تصویر دیکھ کر اور ایک مدھر گیت سن کر بھی ذہنی غسل ہو جاتا ہے' تزکیہ باطن کی یہ ایک ایسی شکل ہے جس سے جامد سوچوں کی تکان دور ہو جاتی ہے اور وہ تازہ دم نظر آنے لگتی ہیں' حد یہ کہ صبح کاذب کے وقت پھول کی پتیوں کو شبنمی آنسوؤں میں تربتر دیکھ کر انسانی آنکھوں کا اچانک بھیگ جانا روح کو غسل دینے کی ایک ادا ہے' مگر اس پائے کے روحانی غسل سے مستفید ہونا زیادہ لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔

سفرنامہ

بحراوقیانوس کے اس پار

سید ضمیر جعفری

دوپہر کے دو بجے لندن کے نئے ایئرپورٹ گیٹوِک سے پی آئی اے کی پرواز نمبر721 سے اڑے اور شام کے آٹھ بجے ڈینور میں آن اترے لندن کے نئے اور پرانے ایئرپورٹ میں وہی فرق ہے۔ جو باپ اور بیٹے میں ہوتا ہے۔ ایک میں تاریخ زیادہ دوسرے میں جغرافیہ زیادہ ایک طرف تقدیس دوسری طرف تزئین ہمیں تو --- "ہیتھرو" کی "بزرگی" کے سامنے گیٹوِک کی تازگی کچھ بھی نہیں۔ مگر وقت اور ابر کب کسی کا انتظار کرتے ہیں۔ راستے میں امریکہ کے (اس طرف سے) ساحلی شہر سینٹ لوئیس میں طیارہ تبدیل کرنا پڑا۔ طیارہ اسی کمپنی کا تھا۔ پرواز کا نمبر تبدیل ہو گیا۔ ڈی این نمبر14۔

ایئرپورٹ پر بارہ بجے پہنچنے کے لئے لیوٹن سے گیارہ بجے نکلے۔ دوپہر کا کھانا جس میں شمیم نے اپنے میرپور کے مخصوص روایتی انداز کے مکھن میں پروتے ہوئے تین پراٹھے خاص طور پر بنائے تھے۔ ہم نے ناشتے ہی میں کھالیا۔ سامان بھی رات ہی کو حمید خان کی "مرسڈیز" کے "بیں تجرے" میں لگا دیا گیا تھا۔ چار تک تو ہم اسلام آباد ہی سے ساتھ لائے تھے۔ تحائف کا ایک "حمید" کل بریڈ فورڈ سے چلتے وقت سید میر حضرت شاہ صاحب نے اقتان' ماری اور ماؤ ضیاء کے لئے ساتھ کر دیا۔ جس کے "موٹاپے" میں کچھ مزید اضافہ حمید خان اور شمیم کی سوغاتوں سے ہو گیا۔ یہ حمید خان کی "مرسڈیز" ہی تھی۔ جس میں ہمارے سمیت جملہ سامان بھی سما گیا۔ گاڑی بھی حمید ہی چلا رہے تھے بلکہ اڑا رہے تھے۔ چوہدری یونس اور کرنل اقبال بھی ایئرپورٹ تک ساتھ آئے حمید کے ہاں سے نکلنا گویا اپنے گھر سے نکلنا تھا۔ اس کی "ب جی" (والدہ) اور شمیم اور بچی کنول۔ سڑک تک آئے۔ کنول تو مچل کر رونے ہی لگی۔ ہمارے دل بھی بہت بوجھل ہوئے۔ چوہدری محمد رشید صاحب (چیئرمین بلدیہ میرپور) نے حمید کے خلق و تپاک کی جو تعریف کی تھی اس نوجوان کو اس سے زیادہ پایا۔

لندن کی حاشیاتی شاہراہوں پر نوع نوع کی گاڑیوں کے مانوس سیلاب میں بہتے بہتے ہم ساؤتھ ہال میں حمید صاحب کے "فروٹ مارٹ" پر ٹھہرے جہاں ماجد خان صاحب سفر کے لئے ہمارے ٹکٹ اور کھانے کے لئے ہسپانیہ کی "ایلچی" لئے بیٹھے تھے سفر کے بارے میں کل کی خبر یہ تھی کہ ہم پی ڈبلیو اے کی پرواز 762 سے سیدھے ڈینور جارہے تھے جس کی اطلاع ہم ٹیلی فون پر ڈینور میں ماری جان کو بھی دے دی اب جو ٹکٹ دیکھے تو معلوم ہوا کہ ہم پرواز نمبر721 سے جارہے تھے نیز یہ کہ ہمیں سینٹ لوئیس میں طیارہ تبدیل کرنا ہوگا۔ بلکہ کسٹم کے مرحلے سے بھی وہیں گزرنا ہوگا۔ طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ اسلام آباد کے اپنے مہربان خواجہ صاحب کی انتظامی بے پروائی پر تاؤ تو بہت آیا مگر اب سوائے دانت پیسنے کے کیا کر سکتے تھے۔ یہ بھی حمید خان کے روابط موسیاتی ثابت ہوئے ورنہ ہم نہ جانے کتنے دن لندن ہی میں اٹکے رہتے ڈینور کی براہ راست پرواز کے لئے آخری لمحے کوشش کے خیال سے ہم نے لندن میں پی آئی اے کے اسٹیشن منیجر جناب فقیر اللہ جان سے رابطہ قائم کیا۔ جان صاحب سے اپنی الجھن بیان کی۔ کہا --- جان من --- کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟ --- ہر چند ان سے --- کوئی سابقہ ذاتی تعارف نہ تھا۔ مگر فقیر اللہ صاحب فقیر دوست انسان معلوم ہوئے۔ بڑی گرم جوشی سے پیش آئے۔ جان صاحب کے تپاک سے جان میں جان تو آئی مگر وہ بھی کیا کرتے کہ چڑیاں کھیت ہی چگ چکی تھیں عزیزم جمیل نقوی کا ٹکٹ ان کو برمنگھم میں مطلوب صاحب کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ ان سے ٹیلی فون پر دریافت کیا تو یہ پریشان کن خبر ملی کہ مطلوب صاحب نے ٹکٹ تو پہنچا دیا ہے مگر وہ مطلوبہ ٹکٹ نہیں انہیں لندن سے نیویارک تک ہمارے ہمراہ جانا تھا۔ مگر صورت یہ ہوئی کہ ان کو نہ صرف یہ کہ اگلے دن ایک دوسری ائر لائن (کانٹی نینٹل) کے حوالے کر دیا گیا تھا بلکہ رستے میں "فلا ڈلفیا" میں طیارہ بھی تبدیل کرنا تھا۔ جمیل پہلی مرتبہ وطن سے باہر نکلے تھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ سہل پسندی کے اس قدر عادی کہ اگر اپنے ایک ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھنا ہو تو اس کے لئے بھی ملازم کو آواز دیں گے۔ انگریزی جو تھوڑی بہت آتی تھی۔ مدت کی غتر بود ہو چکی تھی۔ ذہن میں کچھ ہوتی بھی ہے تو زبان پر نہیں آتی۔ بیچارے کو سخت متوحش پایا۔ بولے --- بھائی جی! میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی --- شکوہ بجا تھا۔ ہمارے

پاس حرف تسلی ہی تھا جو ان کی نذر کرتے ہوئے کہا ------ عزیزم! کشتی خدا پہ چھوڑ دو لنگر کو توڑ دو! ہر نام پر مسافروں کی مدد اور معلومات کا پورا پورا انتظام ہوتا ہے۔ رکھ سائیں تے

"گٹدوگ" (نیا ہونے کے باعث) ہیتھرو سے زیادہ مربوط اور آمدورفت کے لئے سہل ایئرپورٹ ہے۔ مسافر ایک دروازے سے داخل ہو کر چلتے چلتے۔۔۔ ایک سیدھی راہ داری کے ساتھ لگا لگا ۔۔۔ سیدھا اس دروازے پر جا پہنچتا ہے کہ جب وہ کھلتا ہے تو طیارے کے اندر ہی کھلتا ہے۔ یہاں برطانیہ "آسان" تھا مگر امریکہ "مشکل" معلوم ہوا کہ "امریکی ایئر لائن" کی "داخلہ چوکی" پر بیٹھے ہوئے امریکی وزارت داخلہ (امی گریشن) کے اہلکار مسافروں کی بڑی کڑی (بلکہ کڑوی) جانچ پڑتال کرتے ہیں۔۔ ہمیں یہ پوچھ گچھ ناگوار تو بہت گزری مگر۔

شعلے سے بے محل تھا الجھنا شرار کا

ہمارا مکالمہ جس اہلکار سے ہوا وہ بدتمیز ہونے کے علاوہ بدشکل بھی تھا۔ ہم نے اپنی جہاں گردی" کے ثبوت میں اپنے دو تین پرانے "پاسپورٹ" بھی اپنے --- "چالو پاسپورٹ" کے ساتھ نتھی کر رکھے تھے۔ امریکی اہلکار --- جو خود فربہ اندام تھا--- ہمارے پاسپورٹ کے "تن و توش" دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ خاصے نا ملائم لہجے میں بولا۔

"تم دنیا میں آخر کس لئے اتنا گھومتے ہو؟"

ہم نے جواب میں کہا--- تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ! ------"

ہم اگست کے آخری ہفتے میں دوبئی گئے تھے۔ وہ کچھ دیر پاسپورٹ پر دوبئی کے عربی "دخول و خروج" پر اٹکا رہا--- پوچھا۔

دوبئی کیوں گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ جو دیا کہ ہمیں ملک اور لوگ دیکھنے کا شوق ہے۔ یہاں نہ آتے تو تمہیں سے کیسے ملاقات ہوتی۔

وہ ذرا سا مسکرایا تو سہی - مگر فوراً ہی ہونٹ بند کرتے ہوئے ہمارے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا یہ سامان خود باندھا تھا۔ یا کسی دوسرے شخص سے بندھوایا تھا؟

ہم نے جواب دیا۔

یہ سامان میری بیوی نے باندھا تھا۔ سامان ہی نہیں ہمارے ہاں بیویاں شوہروں کو بھی باندھے رکھتی ہیں۔

پیادہ پتھر تو نہیں تھا وہ آخر اس نے ہنستے ہنستے داخلے کی مہر اٹھا کر ہمارے پاسپورٹ پر ثبت کر دی۔

جرمنی میں ماحول کی آلودگی

حمید اور یونس ہمیں گیٹ نمبر 17 کی نشست گاہ میں "کافی ہاؤس" کے ساتھ بٹھا کر--- رخصت ہوئے تو اتنی دیر میں کہ بمشکل ہم نے--- کافی--- ختم کی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ مسافروں کو بیس بیس کے جتھوں میں--- یکے بعد دیگرے---- اندر بھیجا گیا۔ جس سے "نشست آرائی و قطار بندی" تو واقعی سہل ہو گئی لیکن وہ جو آپس میں کھوے سے کھوا چھلنے کا لطف ہوتا ہے' اس سے محروم رہے۔

"ٹی ڈبلیو اے" کا یہ 747 طیارہ بڑا صاف شفاف براق تھا۔ نشستیں نرم و گداز تھیں مگر جہاز قدم قدم آباد نہ تھا۔ نشستوں کے کئی سلسلے درمیان میں خالی پڑے تھے۔ ایک سہ نشستی خلا میں ایک "قتالہ عالم" پوری کی پوری لیٹی ہوئی تھی۔ خود بھی دراز قد اور زلفیں بھی دراز۔ جو ان کشوروں میں بہت کمیاب ہوتی ہیں۔ پھر اس کافر کی زلف اس وقت کچھ اس طرح آوارہ بھی ہو رہی تھی کہ بال بال گویا زبان حال سے پکار رہا تھا۔

دونوں جہاں ہیں آج میرے اختیار میں

میزبان لڑکیوں میں خال خال ہی کوئی مندچیت لاگن تھی۔ خوش اخلاق سبھی تھیں مسکرانا ان بیچاریوں کے فرض منصبی میں شامل ہے۔ سو جہاں تک ان کے بس میں تھا' بڑی دلنواز مسکراہٹوں کے ساتھ مسافروں کو مشروبات و ماکولات پیش کر رہی تھیں۔ کسی ہوائی جہاز میں پہلی مرتبہ دودھ ملا۔ قتیل شفائی یاد آ گئے۔ چند برس پہلے امریکہ کینیڈا کے سفر میں ان کی ہم سفری کے دوران میں اندازہ ہوا کہ ہماری طرح وہ بھی افرنگ کے خالص خوش ذائقہ دودھ کے کتنے رسیا تھے ہم نے ایک گلاس اپنے لئے اور دوسرا گلاس قتیل شفائی کے لئے نوش جان کیا۔ جہاں آراء نے "کوک" لیا اور--- حسب معمول--- اپنی لمبی تسبیح پھیرتی رہیں۔

مسافر--- ہمارے سواء---- سبھی افرنگی تھے۔ اعلانات ہمارے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ ہمارے پہلو میں ایک نو افرنگی نوجوان بیٹھا تھا۔ ایک اعلان پر ہم نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "کپتان صاحب نے کیا کہا ہے"

ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی' جب اس نے بھی لاعلمی کے اظہار میں دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے---- وہ جرمن نکلا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے جمیل نقوی کی طرح--- پہلی مرتبہ وطن سے باہر نکلا تھا۔ انگریزی میں شدبد تو تھی مگر امریکی انگریزی اور امریکن لہجے سے نابلد تھا۔ یوں ماحولیات کے مضمون میں ہندسی کی اعلیٰ ترین ڈگری اس کے پاس تھی۔ خدا کا شکر کہ اس کو گفتگو پر مائل پایا۔ دونوں طرف انگریزی کا یہ عالم تھا کہ اگر ایک آدمی کی انگریزی ٹوٹ جاتی تو دوسرے آدمی کی

انگریزی بھی دم توڑ جاتی تھی۔ تاہم---- پاکستان کی جمہوریت کی طرح---- ہم دونوں کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ کر چلتا رہا۔ نام اس نوجوان کا گیلڈر تھا۔ دادا تک ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ---- وان--- کا جاگیردارانہ لاحقہ بھی لگا رہا تھا۔ خاندان کا شاید ہی کوئی "وان" طبعی موت مرا تھا۔ سبھی جنگ میں دوسروں کو مارتے ہوئے مارے گئے۔ اسی لئے نوجوان گیلڈر جنگ کے سخت خلاف تھا۔ کہنے لگا--- جنگ کے پاگل پن میں ایک پوری قوم ایک پوری دوسری قوم کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ اور فتح کی صورت میں--- "جشنِ قتل" مناتی ہے۔ ہٹلر کی آمریت کے بعد وہ امریکی جمہوریت کو پسند کرنے لگا تھا۔ جمہوریت کے احترام و اجلال میں اس نے صدر روز و یلٹ کے ہاتھوں اپنے شہنشاہ قیصرولیم کی خفت کا لطیفہ بھی سنایا---- یہ اس صدی کے دوسرے عشرے کا واقعہ تھا۔ روز و یلٹ جرمنی آیا تو قیصر کو ملاقات کے لئے مراسلہ بھیجا۔ قیصر نے جواب دیا۔ "بسرو چشم۔ مگر میرے پاس صرف تیس منٹ ہوں گے"۔ روزویلٹ نے جواب میں لکھا---- "میرے پاس صرف دس منٹ ہیں"۔

ہم نے جدید جرمن فوج کے بارے میں معلوم کرنا چاہا کہ تیاری کا کیا عالم ہے۔ معلوم ہوا کہ نوجوان کو کچھ معلوم نہ تھا۔ جواب اعداد کے بجائے فلسفے میں دیا۔

"جرمنی کی قوت فوج میں نہیں۔ فلسفے اور فیکٹری میں ہے۔ اس کی تائید میں ایک مشہور کہاوت ہم نے بھی تائید میں پیش کر دی کہ --- جرمنی نے قیصر تو کئی پیدا کئے مگر دوسرا گوئٹے پیدا نہ کر سکا۔ نوجوان جرمن انجینئر اتنا خوش ہوا کہ تھیلے میں سے ٹافیاں نکال کر کھانے لگا۔ چند ٹافیاں ہمیں بھی عنایت ہوئیں۔

نوجوان کی گفتگو سے انکسار جھلکتا تھا۔ تاہم کبھی کبھی اپنے نسلی تفاخر کی چنگاری بھی جاگ اٹھتی۔ کہنے لگا---- "امریکہ بے شک سپرپاور ہے مگر مستقبل کا پلڑا یورپ کی طرف جھک رہا ہے اور یورپ کی قیادت جرمنی کے نام لکھی جا چکی ہے۔ ثبوت میں نوجوان نے نمبروار دنیا کے سات دولت مند ترین ملکوں کے نام گنوائے---- جرمنی' جاپان' امریکہ' فرانس' برطانیہ' ہالینڈ اور اٹلی---- اٹلی کے نام پر ہمیں خاصی حیرت ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ میں ہمیں اطالوی سپاہیوں کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ بچارے ہماری ہی طرح کے سادہ لوح کاشتکار تھے۔ جنگ میں مکمل تباہی کے بعد اٹلی کی بحالی پر یقین نہ آتا۔ مگر وہی بات کہ

اس سے آگے بھی کتنے مقامات ہیں
جس سے آگے کوئی اور رستہ نہیں

سینٹ لوئیس کی لڑکی

"سینٹ لوئیس" میں ہم (امریکی وقت) کے مطابق چار بجے سہ پہر اترے۔ نیچے مسلسل بحر اوقیانوس گزرتا رہا۔ (دراصل بادل گزرتے رہے) ایک مرتبہ کپتان کے ایک اعلان سے کچھ ایسا شبہ ہوا کہ جیسے ہم کینیڈا کے کسی علاقہ پر سے بھی گزریں گے۔ بے خبری میں بھی آدمی کتنی خوش گوار حیرتوں سے گزرتا ہے' بے شک وہ عارضی خوش فہمیاں ہی کیوں نہ ہوں۔

امریکہ کا جغرافیائی نقشہ ہم نے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ "سینٹ لوئیس" کے نام پر ہمارے اپنے شہر میں مسیحی بھائیوں کا ایک اسکول تو موجود ہے لیکن ان بزرگوار کے نام پر امریکہ کے کسی شہر کا نام -- ہم نے نہیں سنا تھا۔ ہوائی جہاز سے یہ خاصا بڑا شہر معلوم ہوا۔ "ٹی ڈبلیو اے" کا ہیڈ کوارٹر بھی یہی تھا۔ چنانچہ اس کے ہوائی مطار "   " پر اس کے اپنے ہوائی جہازوں کی چھاؤنی کا گمان ہو رہا تھا۔ چند جہاز دوڑ رہے تھے۔ چند اڑ رہے تھے۔ کچھ اتر رہے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم کسٹم کے مرحلے اور اگلے جہاز کو پکڑنے کی پریشانی میں سینٹ لوئیس کی چہل پہل کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہ سکے۔

دل اجڑ جائے تو شہروں میں بھی تنہائی بہت"

دو تین - - - - خودکار زینے اترنے چڑھنے کے بعد ویزا پڑتال کی چوکی آگئی۔ پہلو بہ پہلو واقع چھ سات جھروکوں "کاؤنٹروں" پر سامنے آنے والے مسافروں کی لمبی لمبی قطاریں لگ رہی تھیں۔ ائرلائن کی ایک اہلکار لڑکی-- بہ آواز بلند مسافروں کی رہنمائی کر رہی تھی کہ کس ملک کے مسافر کو کس قطار میں جانا ہوگا۔ ہم نے اپنی قطار کی نشان دہی چاہی تو گھبراہٹ میں ایسا گوشوارہ بھی جو ہم نے ہوائی جہاز میں بھرا تھا اس بی بی کو دکھا دیا۔ بیڑہ غرق --- گوشوارے پر ایک نگاہ ڈالتے ہی کوئی شتر گربہ پکڑ لیا۔ انگلی کے اشارے سے ہمیں قطار سے نکلنے کو کہا اور اپنے اور اپنے پیچھے لگائے لگائے ایک خالی جھروکے - - - کے سامنے بیٹھنے کی تاکید کر کے خود مسافروں کے ہجوم میں جاکر ڈوب گئی۔ لوگوں کی بھیڑ میں وہ ذوقی چمکتی دکھائی تو دے رہی تھی۔ مگر ہماری طرف آنے میں نہیں آرہی تھی۔ ادھر ذہن میں وسوسوں کی گھٹائیں امنڈی چلی آرہی تھیں کہ خدا معلوم کیا "پھڈا" پڑ جائے؟ ڈینور کا جہاز چھ بجے اڑنے والا تھا؟-ڈر تھا

کیس موصوفہ کی واپسی تک اگلی پرواز ہی سے کہ رہ جائیں بارے کہ وہ آگئی اور اسطرح کہ جیسے چمن میں بہار آگئی ہو۔۔۔۔۔۔ واقع یہ ہے کہ اس کے پیکر میں ہمیں تو گویا آغا حشر کاشمیری کے ایک ڈرامے کی۔۔۔۔۔۔ نیک پروین۔۔ مل گئی۔ دلوں کا حال جاننے والی اس لڑکی نے پہلے تو ہمیں اطمینان دلایا کہ اگلی پرواز تمہارے بغیر روانہ نہیں ہوگی۔ پھر "قطار بدر" کرنے کی وجہ بتائی کہ تم نے تو "گوشوارہ" ہی غلط بھرا ہے غلطی تفصیل کی نہیں تھی ترتیب کی تھی۔ مثلاً والد صاحب کی سطر میں اپنا نام لکھ دیا تھا اور اپنی سطر میں قبلہ والد صاحب کا نام۔ جہلم امریکہ اور ڈیور پاکستان میں مقامات آہ و فغاں اور بھی تھے۔۔۔۔۔ ہمیں اپنی اس بدحواسی پر سخت ندامت ہورہی تھی۔ نئے گوشوارے کی خانہ پری کے لئے قلم نکالا تو اس مہربان خاتون نے اپنا قلم نکالتے ہوئے کہا۔

"لایئے میں بھر دیتی ہوں۔

وہ بہت خوش خط تھی۔ ذہین بھی بلا کی۔ گوشوارے کے اتنے بہت سے کوائف فر فر پڑھتی اور کسی الجھن کے بغیر لکھتی چلی گئی۔ میرے والد صاحب کو خود اپنی سوجھ بوجھ سے چھانٹ کر الگ کرلیا۔ صرف ہماری اہلیہ ۔۔۔ جہاں آرا کے نام پر قدرے اٹکی ۔ ایک رومانوی سا لطیفہ بھی اس محل پر ہوگیا۔ جہاں آرا کے پرانے پاسپورٹ پر ان کی جوانی کا فوٹو چسپاں تھا۔ جس کو دیکھکر اس بی بی نے بے ساختہ کہا ۔۔۔۔ آپ کی بیوی تو بڑی خوبصورت خاتون ہیں اور اس پر جب ہم نے کہا کہ ہم نے آخر کچھ دیکھ کر ہی ان سے شادی کی تھی۔۔ تو وہ بہت ہنسی بلکہ ہنستے ہنستے اس نے جہاں آرا کا ہاتھ تھام لیا ۔ جو اپنی جگہ حیران کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ ۔۔۔۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔۔۔۔۔ ماجرا صرف اتنا تھا کہ اس ملک میں ہم لوگوں کی "جن کو یہ سینئر شہری کہتے ہیں" بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے اس نے صرف گوشوارہ بھر کر دیا۔ بلکہ ساتھ ہو کر کسٹم ۔ مراحل سے بھی نکلوایا۔ اور پھر اگلی پرواز کے گیٹ تک ساتھ ساتھ رہی۔ راستے میں جہاں آرا نے کئی مرتبہ ہم سے کہا۔۔ تم نے تو انگلی پکڑنے کے بعد اس کا پونچھا ہی پکڑ لیا۔ افسوس کہ اس بی بی کا نام میرے قابو میں نہ آسکا ورنہ میں اس مقام پر نام لے کر اس نیک نہاد خاتون کا شکریہ ادا کرتا۔

گوشوارے بھرتے ہوئے ۔۔۔ نیک پروین نے کسٹم کے مرحلے کے بارے میں بڑے معذرت خواہانہ لہجے میں یہ بتایا تھا کہ چونکہ دنیا کے جس علاقہ سے ہم آئے ہیں اس طرف سے آنے والوں کا سامان ضرور کھلوایا جاتا ہے ۔ آپ اس کا برا نہ مانیئے گا۔ چنانچہ سامان کھلوایا گیا۔ مگر بڑے ادب اور قرینے کے ساتھ۔ اہلکاروں نے سوٹ کیس کھولے اور بند کرنے میں ہماری اعانت کی ساتھ ساتھ معذرت بھی کرتے رہے۔ مشرق وسطیٰ کے بعض عرب ممالک کی طرح نہ کسی نے خونخوار آنکھوں سے ہمیں دیکھا نہ سامان اٹھا کر پھینکا گیا۔

ایک لڑکا

اس ناقابل فراموش لڑکی کے بعد ایک ناقابل فراموش لڑکے سے بھی ملاقات ہوگئی۔ یہ ڈیور کے طیارے میں ہمارا ہم نشین ہوا۔ لڑکی کا نام تو ہم بھول گئے لیکن اس لڑکے کا نام نہیں بھولے۔ ٹرنر۔ لیفٹنٹ ٹرنر۔ تھا بھی اپنی فوجی وردی میں ملبوس ۔ ۔ ٹرنر کی ٹرن آوٹ دل کو لبھانے والی تھی۔ جیسے انگریزی کے زمانے میں اردو ادب کے مشہور مزاح نگار جنرل شفیق الرحمان ہوا کرتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ جرمنوں کے نرغے میں آگئے تو جرمنوں نے اتنے سمارٹ شخص پر لیفٹن قل داغنے سے گریز کیا۔ دنیا بھر کے فوجیوں کی ایک عالمی برادری ہے۔۔ ایک سابق فوجی ہونے کے ناطے سے ہم لیفٹنٹ ٹرنر کے بزرگوں کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہ چکے تھے۔ سو اس فوجی نیچے سے "گفتگو کی" سلسلہ جنبانی کو اپنا حق سمجھا پھر "فیر" داغ دیا کہ تمہارا تعلق توپ خانہ سے ہے گولہ نشانے پر جاکر لگا۔

جی ہاں

بات چل نکلی ۔۔۔۔۔۔ وہ عراق کی جنگ میں شامل رہا تھا۔ ویسٹ پوائنٹ "فوجی اکادمی" سے نکلتے ہی سیدھا "طوفان صحراء" (Desert Storm) میں۔ اس پر مجھے اپنا بیٹا (اب کرنل) احتشام یاد آگیا' جس کو 1971ء کی "پاک بھارت" جنگ میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے نکلتے ہی۔ راجپو تانے کے محاذ پر دشمن کے خلاف سینہ سپر ہونا پڑا۔ آج کل لفٹنٹ ٹرنر کی "فیلڈ بیٹری" جرمنی میں ہے۔ فرینکفرٹ سے کوئی ساٹھ میل دور ایک جنگل میں خیمہ زن تھی۔ وہ پندرہ روز کی چھٹی پر "ڈیور" جارہے تھے جہاں اس کی منگیتر اور والدین رہتے تھے۔ ٹرنر کے بقول ان کی بیٹری توپ خانے کی پہلی یونٹ تھی جو جرمنی سے "دمام" میں اتاری گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت بھی جرمنی میں امریکی فوج کی ایک پوری "کور" (تین ڈویژن فوج) پڑی ہے۔ عراق کی جنگ پر بھی گفتگو ہوئی۔ وہ اپنے "رینک" سے کچھ زیادہ ہی اونچی باتیں کرنے کا اہل معلوم ہوا۔ مثلاً اس کا یہ کہنا کہ۔ جنگ میں حیرتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ ہمارے "ٹاپ باس" (قیادت اعلیٰ) کے بھی کئی اندازے غلط نکلے۔ مگر اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جنگ میں فتح کا سہرا فضائیہ کے سر

رہا۔ زمینی فوج کو کچھ ایسی مزاحمت کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا۔ جو کسر فضائیہ سے رہ گئی تھی۔ وہ ہماری توپوں نے نکال دی۔ ہمارے پہلے ہی حملے میں عراق کا سارا مواصلاتی نظام ٹھپ ہو گیا۔ محاذ کی صف بندی کے بارے میں کہا۔" ہم خیموں میں تھے اور عراقی مورچوں میں۔ ان کی مورچہ بندی کا گہرا اور مربوط سلسلہ کئی کئی میل تک چلا گیا تھا۔ ان کی "چال" یہ تھی کہ ہم آگے بڑھ کر عراقیوں کی گولہ باری کی دو طرفہ باڑھ میں پھنس جائیں۔ مگر ہماری ٹاقت سے بہت جلد عراقیوں کیلئے اس کے سواء کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ہتھیار پھینک دیں یا مورچوں کے اندر بھوکے پیاسے ہلاک ہو جائیں۔

سیاست کے مد و جزر سے بھی یہ نوجوان فوجی افسر خاصہ آگاہ نکلا کہنے لگا۔" صرف برطانیہ کی "خاتون آہن" مارگریٹ تھیچر۔ دل و جان سے ہمارے ساتھ تھی۔ فرانس کے صدر متراں متذبذب تھے کہ۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ جرمنی کے کوہل صاحب آخر دم تک مذاکرات کا مشورہ دیتے رہے۔ جنگ میں بھی انہوں نے دامے درمے ہی امداد کی۔ "قدمے" کوئی مدد نہ کی۔ اٹلی کی پارلیمنٹ جنگ کے مسئلہ پر خود خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئی کہ مشرق وسطیٰ میں امریکی مفاد کیلئے ہم کیوں لڑیں۔ مریں۔ وزیر اعظم بڑی مشکل سے اپنی پارٹی کو سمجھا سکا۔ ایک مرتبہ اپنے خطاب میں یہاں تک کہا کہ اوئے بے غیرتو دوسری جنگ کا زمانہ یاد کرو جب امریکہ کے نوجوان ہمیں موسولینی اور ہٹلر کی فسطائیت سے نجات دلانے کیلئے اپنی جانیں نچھاور کرتے رہے۔ روس آخر وقت تک اپنے سیاسی حلیف صدام حسین کو راہ راست پر لانے کیلئے کوشاں رہا۔ بغداد میں روس کا سفیر گورباچوف کا آخری پیغام لئے صدام حسین کو ڈھونڈھ رہا تھا کہ جنگ چھڑ گئی اور وہ خط ایک پناہ گاہ میں وزیر خارجہ۔ طارق عزیز تک پہنچ سکا۔

ٹرنر کی باتوں میں ظرافت کی چاشنی بھی تھی۔ ہم نے صدام حسین کے زبردست پروپگنڈے کا تذکرہ کیا تو کہنے لگا۔ یہ اسی قسم کا پروپگنڈا تھا جس کا فائدہ دوستوں سے زیادہ دشمنوں کو پہنچتا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ڈینور میں اترنے کا اعلان ہو گیا۔ لیفٹنٹ ٹرنر نے بتایا تھا کہ اس کے والدین اور منگیتر۔ ڈینور ایئرپورٹ پر موجود ہوں گے۔ وہ موجود تھے۔ لیفٹنٹ ٹرنر نے جب پہلا بوسہ اپنی ماں کا لیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ دنیا میں صرف ماں کا وجود ایسا ہے جو انسانوں اور قوموں اور ملکوں کے درمیان فاصلوں کو کم کر سکتا ہے۔

(11 ستمبر 1991ء)

ڈینور میں

"سینٹ لوئیس" سے ایک درمیانہ جہاز ملا۔ طیارہ کے اٹھنے پر شہر پہ نگاہ ڈالی تو دور دور تک ایک خوبصورت اور سرسبز شہر بچھا ہوا پایا۔ جہاں تک نگاہ جاتی۔ زمین پر موٹریں دوڑتی دکھائی دیتیں۔ مگر جلد ہی منظر شام کی سرمئی چادر میں اوجھل ہو گیا تا آنکہ ڈینور شہر کی روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ اس سفر کی ایک "لذت" ہمیشہ یاد رہے گی کہ جو اول جلول جی میں آتا' بے تکلف بہ آواز بلند بک دیتے۔ نہ وہاں کوئی ہمارا شناسا' نہ کوئی ہماری زبان سمجھنے والا---- بے شناختی بھی کتنی بڑی نعمت ہے! ڈینور "ائرپورٹ" پر اقتدار' ماری اور ماہ نیلو کو موجود نہ پا کر حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔ سامان ڈھونے والی "زنجیر بستہ" ٹرالی کو زنجیر سے چھڑانے کے لئے ایک ڈالر "25 پاکستانی روپوں کے برابر) مشین میں ڈالا تھا۔ ٹیلی فون کے لئے بھی ایک امریکی اٹھنی درکار تھی۔ ہمارے پاس دس دس ڈالر کے "نوٹ" تو تھے۔ سکے نہ تھے۔ دو برس قبل سڈنی (آسٹریلیا) میں اس کوفت سے دوچار ہو چکے تھے آج پھر اسی پریشانی کا سامنا تھا۔

ایک سیاہ فام قلی سے استمداد چاہی۔ خدا اس کا بھلا کرے وہ ہمیں تیسری منزل پر ایک بنک میں لے گیا۔ وہاں ایک تنہا خاتون۔ "خود کوزہ و خود گل کوزہ" بنی بیٹھی تھی۔ ہم نے محترمہ سے ریز گاری مانگی۔ دس کا "نوٹ" پیش کیا۔ اس نے ایک ایک ڈالر کے دس "نوٹ" ہمیں تھما دیئے۔ ہم نے کہا---- "اے بی بی!---- ہمیں تو ٹرالی کی مقناطیسی زنجیر اور ٹیلی فون کے لئے سکے---- چونیاں اٹھنیاں درکار ہیں۔ اس نے نہایت ملائم ریشمی سے لہجے میں معذرت کر دی کہ ریز گاری ان کے پاس نہیں ہوتی' حالانکہ اس کے ایک ایک لفظ میں---- چونیاں اٹھنیاں ہی کھنک رہی تھیں۔ وہ بھانپ گئی کہ کوئی دیہاتی بحران میں مبتلا ہے۔ چند قدم پر سامنے ہی عوامی ٹیلی فون کا غرفہ موجود تھا۔ وہ خاتون اپنا کام چھوڑ کر ہمیں ٹیلی فون تک لے آئی۔ "نمونے" کے ساتھ ہی ایک اور مشین نصب تھی۔ کہا---- "اس میں ایک ڈالر ڈالو"---- ڈالر مشین کو سونگھایا ہی تھا کہ مطلوبہ سکے کھٹ کھٹ کرتے مشین کی جھولی میں آ گرے۔ بعد میں اقتدار کے یاد دلانے پر یاد آیا کہ ہم سکوں کے بغیر بھی---- کسی مقام پر---- فون کی "کولیکٹ کال" کر سکتے تھے۔ ٹیلی فون والے اگلے آدمی سے اتنا پوچھتے ہیں کہ اس نام کے باشندہ کی "کال" آپ کو منظور ہے یا نامنظور۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اپنے لئے بہت سی پریشانیاں ہم خود بھی پیدا کر لیتے ہیں۔

باقی صفحہ 72 پر

ھنسنا

پروفیسر عطا اللہ عالی۔ (خانیوال)

بادی النظر میں تو یہ عنوان پڑھ کر لگتا ہے۔ جیسے "ہنسنا" کسی بیماری کے بارے میں کوئی معرکتہ الآرا مضمون ہے۔ اب "ہنسنا" کیا بات ہوئی۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کھانسنا' کانپنا وغیرہ۔ پیارے قارئین! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ ہمارے ہاں چھپنے والے بیشتر مواد کا تعلق بیماریوں سے ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی بیماری کے بارے میں لکھتا ہے کوئی عالت بیماری میں لکھتا ہے کسی کی بیماری جسمانی ہوتی ہے کسی کی ذہنی' بات ہنسنے سے چلی تھی کہاں پہنچ گئی۔ ہنسنا کوئی مرض نہیں ہے اسے مرض وہ سمجھتے ہیں جو اس تندرست مرض سے کوسوں دور ہوتے ہیں اور اپنی ذاتی کوششوں سے مزید دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بعض اوقات یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ہم ہنستے کیوں ہیں؟ یہ مسئلہ اس وقت سے حل طلب ہے۔ جب سے حضرت انسان نے ہنسنا شروع کیا اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے بہت سے نظریات پیش کئے گئے۔ بڑی بڑی آرا ظاہر کی گئیں جنہیں پڑھ کر لوگ اور بھی ہنسے اور کافی دیر تک ہنستے رہے۔ اس لئے ہمارا ارادہ کوئی نیا نظریہ پیش کرنے کا نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہ لیا جائے کہ ہم کوئی پرانا نظریہ دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہمیں ہنسی آتی ہے اس لئے ہم ہنستے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں ہنسی بھی آتی ہے لیکن وہ نہیں ہنستے بہت سے لوگوں کو ہنسی آئے نہ آئے وہ ہنستے ہیں اور ہنستے ہی چلے جاتے ہیں انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ ہنستے ہیں تب یہ ان کے ہنسنے پر ہنستے ہیں کہ بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے والی بات ہے۔

بھوک نہ لگنا ایک بیماری سمجھا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ بہت سوں کو بھوک لگنے کی بیماری ہوتی ہے نیند نہ آنے پر لوگ بے خوابی کا شکار ہو کر کسی ڈاکٹر کا شکار ہو جاتے ہیں اور تو اور کوئی بچہ یا بڑا بچہ رونے والی بات سن کر نہ روئے تو لوگ اسے بھی بیمار سمجھتے ہیں اور اس قدر سمجھتے ہیں کہ اسے بھی سمجھا بجھا کر بیمار کر دیتے ہیں اور پھر وہ بیچارہ جو رونا شروع کرتا ہے تو کبھی دہاڑیں مار مار کر روتا ہے تو کبھی زار و قطار اور جب وہ آٹھ آٹھ آنسو رو چکتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

لیکن نہ ہنسنا کوئی بیماری نہیں سمجھا جاتا ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر قبض ام الامراض ہے تو نہ ہنسنا غم الامراض۔

ہنسنے کے بہت سے طریقے ہیں ہر ایک طریقے میں منہ ہی سے ہنسا جاتا ہے لیکن صاحب دنیا جدت طرازوں سے بھری پڑی ہے جو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی الگ راہ نکال ہی لیتے ہیں اور جب یہی جدت طراز منہ پھاڑنے یا باچھیں پھیلا کر مسکرانے کو اچھا نہیں سمجھتے تو ہنسنے کے لئے دیگر اعضائے غریبہ کو کام میں لاتے ہیں۔ ان میں بعض اس مقصد کے لئے ناک استعمال کر لیتے ہیں۔ کچھ آنکھوں سے مسکراہٹ بکھیرتے ہیں۔ مسکراتی آنکھوں کے بارے میں تو ہمارے شاعروں نے دیوان کے دیوان لکھ چھوڑے ہیں۔ ہنسنے کے لئے جو صاحب دل ناک استعمال کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ استعمال کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ جب بھی انہیں ہنسنے کی حاجت ہوتی ہے۔ تو وہ منہ سختی سے بند کر کے ناک سے اک ادائے دلبری کے ساتھ کچھ عجیب و غریب آوازیں برآمد کرتے ہیں۔ اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بس ہنس لیا۔ اگر آپ نے وہ "ہولناک" ہنسی ہنسی ہو۔ یہاں "ہول" انگریزی والا پڑھا جائے۔ تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ کس طرح کی آوازیں نکلتی ہیں۔ ہمیں تو بار بار یوں لگا جیسے کسی شریر بچے نے غبارے میں خوب ہوا بھر کے وقفے وقفے سے اس کی ہوا خارج کرنے کا شغل اپنا رکھا ہے۔ یا پھر موسم کی خرابی کی بناء پر ریڈیو سے جس طرح کی شائیں شائیں اور بہت سی نامانوس آوازیں آیا کرتی ہیں۔

بعض ناک سے ہنسنے والے ذرا زیادہ ہی نفاست پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور اپنی ہنسی کا اظہار محض ایک رسمی سی ہونہہ سے کر دیتے ہیں۔ یہ ہونہہ کئی قسطوں میں پوری ہوتی ہے۔ پہلے پہل ایک ہونہہ تیزی سے آتی ہے۔ پھر لگاتار تین چار۔ ہونہہ۔ ہونہہ ہونہہ ہو۔۔۔۔۔۔اوں!

یہ تمام ہونہیں ناک سے سانس کی صورت میں خارج ہوتی ہیں۔ اور ہنسی کا لبادہ اوڑھے ہنسنے والوں کے ذوق سماعت کو جلا بخشتی ہیں۔

جہاں تک مسکراتی آنکھوں کا تعلق ہے۔ تو اس کے بارے میں ہماری معلومات اتنی ہی ہیں۔۔ جتنی شعراء حضرات سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں۔ کہ شاعری میں سب کچھ ہوتا ہے۔ سوائے معلومات کے۔ اس سلسلے میں ہماری ذاتی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ وہ واحد شعبہ ہے۔ جہاں ہم نے بارہا اپنے علم میں اضافے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ اور ہربار ناکامی ہوئی ہے۔

اب اسے لوگ ہماری کور ذوقی کہیں یا احساس جمالیات کا فقدان ہمیں آج تک کوئی آنکھ مسکراتی نہیں نظر آئی۔ البتہ کچھ آنکھیں ہم نے "دبتے" "آتے" اور "لڑتے" ضرور دیکھی ہیں۔

وہ لوگ جو ہرچند کہیں کہ ہیں۔ نہیں ہیں۔ کی عملی تفسیر نظر آتے ہیں۔ کی ہنسی بھی ان کی صحت کی طرح کمزور ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہنس رہے ہیں۔ یا سلوموشن میں کھانس رہے ہیں۔

کھانسی اور ہنسی کا بھی گہرا تعلق ہے۔ بعض حضرات ہنستے ہنستے کھانسنا شروع کردیتے ہیں۔ اور بعض کھانستے کھانستے ہنسنے لگ جاتے ہیں۔

کچھ لوگ ان دونوں کے بین بین ہوتے ہیں۔ پہلے وہ کھانستے ہیں۔ پھر ہنستے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے کھانسی روک کر ہنس لیتے ہیں۔ اور کچھ دیر ہنسی روک کر کھانسنے کا شوق پورا کرلیتے ہیں۔ اور یوں جتنی دیر کہیں بیٹھتے ہیں۔ اپنے اس شغل کی بناء پر کافی مصروف رہتے ہیں۔

کچھ لوگوں کی ہنسی سن کر جنوں کے وجود پر فوراً یقین آجاتا ہے۔ ان لوگوں کی ہنسی کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔ کہ بعض اوقات ہمسائے گھبرا کر خیریت دریافت کرنے آجاتے ہیں۔

ہنسی کا آخری درجہ قہقہہ ہے۔ بعض ثقہ حضرات اسے محفل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ جبکہ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ قہقہہ ہی محفل کی جان ہے۔ جس محفل میں قہقہے بلند نہ ہوں وہاں یا تو کوئی سازش ہورہی ہوتی ہے۔ یا کوئی تعزیتی قرارداد پاس ہونے والی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا ایک مشورہ ہے۔ اگر آپ کسی محفل میں پندرہ منٹ تک بغیر قہقہے کے بیٹھے رہیں۔ تو سولھویں منٹ میں وہاں سے آپ کو رخصت ہوجانا چاہئے۔ اس طرح آپ بہت سی تکالیف اور متوقع مصائب سے بچ جائیں گے------- آزمائش شرط ہے۔

ہر چیز کی طرح ہنسی کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہنسی کی پہلی اور بڑی قسم ہے۔ فی البدیہہ ہنسی---- یہ ہنسی بے اختیار آتی ہے---- اس کی وجہ کوئی اچھا لطیفہ ،کوئی خوبصورت جملہ، غیر متوقع واقعہ، مضحکہ خیز صورت حال یا اپنی بدحواسی یا بے وقوفی ہوسکتی ہے۔ اگر کسی کو مندرجہ بالا تمام حالتوں میں سے کسی پر بھی ہنسی نہیں آتی تو اسے کسی اچھے سے ماہر نفسیات کو دکھانا چاہئے۔ اس کا "دیسی" علاج یہ ہے کہ صبح دوپہر شام دس دس منٹ تک کسی سے گدگدیاں کروائے۔

گدگدیاں کروانے کے لئے کسی ماہر مالشئے کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جو نہایت مناسب داموں پر یہ خدمت بحسن و خوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہنسی کی دوسری قسم "ہلکی ہنسی" ہے۔ یہ ہنسی عام طور پر لوگ روٹین میں ہنستے ہیں۔ اسے خواہ مخواہ کی ہنسی بھی کہا جاسکتا ہے۔ بہت سے لوگ اسے ہنسی نہیں سمجھتے بلکہ اپنی مجبوری گردانتے ہیں۔

ہنسی کی تیسری قسم وہ ہے۔ جو ہنسی کی دوسری قسم کی ارتقائی شکل ہے۔ اسے "خوشامدی ہنسی" کہتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص طبقے میں بڑی مروج ہے۔ عام طور پر یہ ہنسی دفتروں میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ اس کا بہترین مظاہرہ باس کے روبرو کیا جاتا ہے۔

بعض لوگ مشق کی بناء پر اسے اپنے روزمرہ زندگی میں بھی استعمال کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ اور خاصا نفع پاتے ہیں۔ "خوشامدی ہنسی" آگے چل کر ہنسی کی چوتھی قسم میں بدل جاتی ہے۔ یہ وہ قسم ہے جسے عام طور پر لوگ "مکروہ ہنسی" کے نام سے یاد رکھتے ہیں۔

ہنسی کی ایک قسم کھلکھلا کر ہنسنا ہے۔ یہ ہنسی صنف نازک کو خوب زیب دیتی ہے۔ لیکن کوئی اور صنف بھی اس طرح ہنسنا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

ہنسی کی ایک قسم خاصی خطرناک ہے۔ وہ ہے خود بخود ہنسنا----- یہ ہنسنے کی آخری قسم ہے۔ اس کے بعد لوگ اس طرح ہنسنے والوں کو گلی محلوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خوش نصیب پاگل خانے میں باقی عمر بتا دیتے ہیں۔

ایک ان سیانے کا کہنا ہے۔ کہ زیادہ ہنسنا اچھا نہیں ہوتا۔ خدا جانے یہ سیانے صاحب کون تھے۔ ویسے یہ سیانے بھی بڑی عجیب چیز ہوتے ہیں۔

اصل میں یہ سیانے ویانے کچھ نہیں ہوتے---- لوگ انہیں سیانا بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص ساری عمر کچھ نہ کچھ کہتا رہے۔ آخر تھک ہار کر لوگ اسے سیانا ہی کہیں گے۔ یہ تو اسی طرح ہے جیسے ایک شخص بچپن سے شعر کہنا شروع کردیتا ہے۔ اور کہتا چلا جاتا ہے۔ بڑھاپے میں لوگ تنگ آکر شاعر مان ہی لیتے ہیں۔ وہ شاعر بچارہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھ کر اسی حالت شاعری میں چل بستا ہے---- اور اپنے پیچھے بہت سی تقاریب کا سامان چھوڑ جاتا ہے۔

ہنسنا ہماری فطری ضرورت ہے۔ ہمیں ہنسنا چاہئے۔ اور کھل کر ہنسنا چاہئے۔ نازک دلوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچائے بغیر----

کسی کی دل آزاری کے لئے نہیں دلداری کے لئے ہنسئے اور جس سیانے نے زیادہ ہنسنے کو برا کہا ہے تو ان سیانے صاحب اور ان جیسے اور

دوسرے سیانوں کو علم ہونا چاہئے۔ کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو روتے بسورتے گزرے۔

ہنسی اک وہ بھی ہے جو بقول شاعر آتی ہے۔ تو پھر بھی نہیں آتی۔

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پہ نہیں آتی!!

جب کبھی آپ ہنسنے سے گریزاں ہوں تو ایک بات ضرور یاد رکھیے گا۔ کہ انسان ہی وہ جانور ہے جو ہنسنے پر قادر ہے ----- ہمارا خیال ہے کہ کم از کم یہ فرق تو باقی رہنا چاہئے۔

بقیہ: بھیرا و قیانوس کے آس پار

آپ اپنے حق میں اک مکمل پریشانی ہوں میں

گھر فون کیا تو ماری سکتے میں رہ گئی۔

ابو جان آپ کہاں ہیں

"ڈیٹور ائرپورٹ پر"

ابو جان --- وہ بولی --- آپ نے تو لندن سے بتایا تھا کہ آپ بارہ ستمبر کو پہنچیں گے۔ بٹی کیا کیجئے۔ ہم نے کہا --- "شائد ہم سے غلطی ہو گئی۔ یا شائد ہوائی جہاز زیادہ تیز رفتار سے آیا" --- ہم دراصل زمین اور سورج کے بدلتے ہوئے رشتے سے دھوکا کھا گئے تھے۔

"امی گھر پر نہیں ہے"۔ ماری نے کہا۔ "آپ ائرپورٹ کے برآمدے میں ٹھہریئے۔ میں آئی"۔

ہمیں برآمدے میں آئے ابھی پندرہ بیس منٹ نہیں ہوئے تھے کہ ماری اور ماؤ ضیار ایک ہمسائی مسز جیکسن کی موٹر میں پہنچ گئے۔ اور آتے ہی ہمارے سینوں سے چمٹ گئے۔ ماؤ ضیار بچہ ہی تو تھا۔ پاکستان سے آئے اس کو پانچ برس ہو چکے تھے۔ ہم اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے کہ وہ ہمیں شائد نہ پہچان سکے۔ مگر موٹر میں سب سے پہلے اسی نے ہاتھ ہلایا اور "دادی دادی" پکارتا --- دوڑ کر جہاں آرا سے لپٹ گیا۔ ان لوگوں نے اگلے دن کو دوستوں اور گلدستوں کے ساتھ ہمارے استقبال کا دھوم دھامی بندوبست کر رکھا تھا۔ مگر ہم نے ان کو اس کا موقع ہی نہ دیا۔ ماؤ ضی سے پوچھا۔ بچے تم نے ہمیں کیونکر پہچانا ---- بچے کے جواب نے حیران کر دیا ---- میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔

"How can I forget you"

(11 ستمبر 91ء)

بقیہ: دام خیال

پڑے نہ پڑا تو انہیں ایک طویل خط لکھا۔ بہت سے سوال کئے۔ آج تک مجھے اس خط کا جواب نہیں ملا۔

خاصے وقفے کے بعد پھر ان کا ایک خط ملا۔ اس خط میں انہوں نے اس پرچے کی تعریف کی تھی جسے میں ان دنوں مرتب کرتا تھا۔ میری محنت کی داد کھل کر دی گئی تھی اور بس ---

ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میرے اس خط کا ذکر تک نہ کیا جس میں میں نے ان سے کچھ باتیں کی تھیں۔ میں نے بھی اس خط کا ذکر نہ کیا جس میں انہوں نے میری محنت کو سراہا تھا۔ ہم کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتوں میں لگے رہے اور ملاقات ختم ہو گئی ---

اصل میں' میں نے بہت پہلے اندازہ لگایا تھا کہ ممتاز مفتی کو جاننا ہے تو پھر اس سے ذاتی تعلق کا روگ نہیں پالنا چاہئے۔ اس زحمت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ممتاز مفتی کی ساری زندگی اس کی تخلیقات میں موجود ہے۔ وہ "اوکھے آدمیوں" پر لکھتا ہے اور انہیں "سوکھا" اور آسان بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ مگر بہت سی باتیں' بہت سے کردار' بہت سے واقعات ایسے ہیں --- جو ہمیں کسی دوسرے لکھنے والے کے ہاں نہیں ملتے۔ اگر کہیں تھوڑے بہت مل بھی جاتے ہیں تو ہمیں "اوپرے" لگتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے ہاں یہی "اوپرے" واقعات' کردار اور وارداتیں --- ہمیں بے گانہ نہیں لگتے کیونکہ ہمیں ان واقعات کرداروں اور باطنی وارداتوں کے بارے میں یقین ہو نہ ہو' پورا فہم اور ادراک بھی نہ ہو تو ہمیں ایک بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کردار' یہ واقعات اور ایسی باطنی وارداتیں --- ممتاز مفتی کی زندگی کا اپنا حصہ ہیں --- خواہ ان کی پوری' تفصیلی یا منطقی توجیہ ملتی ہو یا نہ ملتی ہو ---

میں نہیں جانتا ہمارے لکھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جو ہمیں ایسا یقین دلا سکتے ہیں ---!!

بقیہ: گردِ سفر

"اچھاں"' "اپ مین اپ" "کنڈی ہلتی رہی"' "دیکھن دکھن" اور "سمجھ" کا طرز ہے۔ یوں دیکھا جائے تو زبان کے ور تارے کی سطح پر آخرالذکر افسانوں میں ہندی زبان کے نزد کے حوالے سے متنوع حال ہی میں سامنے آیا ہے۔

زبان کے استعمال کی سطح پر خاص طرز کی سجاوٹ' نکھار اور شعریت کی بازیافت شروع سے مفتی کے افسانوں کی جان ہے

زندگی کے غیر معروف گوشوں سے

ہم نے صوفی عبدالمجید صاحب (ریٹائرڈ) ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول) موضع ادعڑ ضلع جہلم کو اپنی پسند کے مزاح پاروں کی نشاندہی کرنے کے لئے لکھا۔ درخواست صرف اس قدر تھی کہ ادب کے پرانے ورثے کو ترجیح دی جائے تاکہ آج کے قاری کو سفر کے پیچ و خم کا کچھ اندازہ بھی ہوجائے۔ صوفی صاحب نے ہماری فرمائش پر ہمیں رئیس امروہوی مرحوم کی ایک نظم سے نوازا جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ ہم "چہار سو" کے قارئین سے ملتمس ہیں کہ وہ عوامی سطح پر انتخابات و ترجیحات کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں ہماری امداد فرمائیں ——— (ادارہ) ———

کسی لیڈر سے خطاب ——— رئیس امروہوی

اے چھک چھک انجنِ سیاست
اے دھک دھک موٹرِ قیادت

اے کھد بد ہانڈیٔ تقاریر!
اے پھٹ پھٹ ٹائرِ وزارت
اے پھس پھس شورشِ بیانات
اے گھس گھس خامۂ مقاصد
اے ٹپ ٹپ بارشِ تدبر
اے کل کل دانشِ دلائل

اے چھم چھم زیورِ تدابیر!
اے غٹ غٹ شربتِ وزارت
اے کھس کھس گوشۂ خیالات
اے ٹخ ٹخ ناگنۂ مقاصد
اے سر سر آندھیٔ تفکر
اے پٹ پٹ پلکۂ مسائل

اے ٹک ٹک رستۂ واجِ ملت
اے ٹن ٹن گھنٹۂ قیادت

اے دھپ دھپ ڈھولکِ عوامی
اے ہپ ہپ حلوۂ سیاسی
اے کٹ کٹ مرغۂ الیکشن
اے لٹ لٹ گیسوئے تحمل
اے دھم دھم پائے رہ نمائی
اے سڑ سڑ سالنِ مناصب

اے دھڑ دھڑ تختِ انتظامی
اے کر کر نان خود شناسی
اے چُنغ چُنغ چوزۂ ہر انجمن
اے فٹ فٹ پرزۂ تخیل
اے جھل جھل رختِ پارسائی
اے گڑ گڑ حقۂ مراتب

اے بک بک بحثِ نامکمل
اے جھک جھک گفتگوئے مہمل

اے تن تن تار شان و شوکت
اے بل بل اوٹ سیفٹی ایکٹ
اے گھر گھر پیشۂ ترقی
اے عف عف ناقۂ سوالات

اے چھن چھن پائلِ ریاست
اے ڈھینچو ڈھینچو خرِ بیکٹ
اے فر فر پرچم تسلی
اے رف رف دلدلِ جوابات

غیروں کے بہت پیام پہونچے
میرا بھی تجھے سلام پہونچے

حل ہوگیا ہے مسئلہ جب انتساب کا
اب یہ بھی کوئی کام ہے لکھنا کتاب کا

کھایا ہے سیر ہو کے خیالی پلاؤ آج
پانی پھر اس کے بعد پیا ہے سراب کا

دیکھی ہے ایک فلم پرانی تو یوں لگا
جیسے کہ کوئی کام کیا ہے ثواب کا

شوگر نہ ہو کسی بھی مسلماں کو اے خدا
مشکل سا اک سوال ہے یہ بھی حساب کا

کل شب نظر پڑا ہے وہ انور کو جھوٹ ہے
دیکھا ہے کس نے رات کو منہ افتاب کا

حاصل مطالعہ

آئی ہے ایک بات بہت کھل کے سامنے
ہم نے مطالعہ جو کیا ہے سماج کا

اک مسئلہ ہے سارے گھرانوں میں مشترک
ہر گھر میں ایک فرد ہے ٹیڑھے مزاج کا

رومانی مجرم

بنا رکھی ہے غیروں سے بھی اس نے
وہ ہم سے بھی لگاوٹ کر رہا ہے

کوئی پکڑے نا اس کو بھی تو انور
محبت میں ملاوٹ کر رہا ہے

خدایانِ مجازی خود کو منوانے کہاں جاتے
نہ ہوتیں بیویاں تو رعب دکھلانے کہاں جاتے

غنیمت ہے کہ ان کو مل گئی ہے "جاب" ڈاکو کی
وہ لیکر ڈگریاں ورنہ خدا جانے کہاں جاتے

سبھی بندے شریف النفس گر ہوتے زمانے میں
تو پھر جرگے، کچہری، جیل اور تھانے کہاں جاتے

مہیا گر نہ ہوتے لوگ جلسوں میں کرائے پر
وزیرِ خوش بیاں تقریر فرمانے کہاں جاتے

جنابِ شیخ نے دوپہر میں رندوں سے منگوالی
وگرنہ رات کو مسجد سے میخانے کہاں جاتے

پڑوسن ہی کے دم سے ہے میری شہرت محلے میں
یہ بی بی گر نہ ہوتی میرے افسانے کہاں جاتے

انہیں آباد رکھا ہے سدا فرہاد مجنوں نے
وگرنہ دشت، جنگل اور ویرانے کہاں جاتے

یہ "اپریشن" بھی شاہد ہوگیا ان کی نگاہوں سے
سمندر پار ورنہ دل بدلوانے کہاں جاتے

آس پاس

ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اک بھوکا
روٹی مہنگی ہے آدمی سستا
کیا یہی ہے نظامِ جمہوری
ہورہا ہے جو ہر جگہ گھپلا
راہبر تیری ریشمی باتیں
قوم کے ساتھ ہے کھلا دھوکا
بات بنتی نہیں جفاکش کی
اس کی قسمت میں ہے فقط دھکا
مدرسے میں غریب زادے کو
دوستو داخلہ نہیں ملتا
ہے رسائی تو شہر لندن میں
پڑھ رہا ہے امیر کا بیٹا
میں نے اس کی ہزار منت کی
کام افسر مگر نہیں کرتا
ہوگی اس وقت میری شنوائی
جب لگاؤں گا رشوتی چھکا
کتنا ہی سینچتا رہے کوئی
بیج سڑ جائے تو نہیں اگتا
ہو نہ جس شاخ میں نمی اطہر
پھول اس پر کبھی نہیں کھلتا

ضمیر بات

سید ضمیر جعفری

ہوگیا ہے دل مضطرب کچھ اور اس تسکین سے
پاپ موسیقی اچھالی جارہی ہے بین سے

جس سے ملت میں ہو پیدا انتشار و افتراق
سوچئے یہ دوستی یا دشمنی ہے دین سے

کچھ کجی نیت میں ہوگی' کچھ کمی اخلاص میں
قوم پس ماندہ ہو کیوں اللہ کے آئین سے

بن گیا مغرب میں آخر مستقل طرز حیات
اک سرور عارضی --- "افیون اور کوکین" سے

امن عالم بھی رہے قائم---- غلط یکسر غلط
جو نظام نو بنے گا ٹینک سے یا ٹین سے

اہل مغرب کر چکے ہیں ریت سے ایٹم الگ
بات یہ کہہ دے کوئی مولانا صدر الدین سے

زندگی کا فلسفہ سمجھیں گے کیا فی الحال تو
جان کے اندر ہے اک ہیجان برپا "جین[1]" سے

کس قدر مشکل رہا جینا---- مگر جیتے رہے
زندگانی کی بسر اک "سنکر تمکین" سے

شہر لندن میں صحیفہ[2] دختر سالک کے گھر
ہم سے کچھ اشعار سرزد ہوگئے تمکین سے

1۔ بے حد تنگ پتلون۔
2۔ نامور ادیب بریگیڈیئر صدیق سالک شہید کی بیٹی

کلچے سے برگر اچھے ہیں
گھوڑے سے خچر اچھے ہیں

انڈے بھی ہونگے اچھے ہی
جس مرغی کے پر اچھے ہیں

اس گھر کی دولہن خوش قسمت
جس گھر کے "دیور" اچھے ہیں

وہ جب پیاری ہے' تو اس کے
سارے "اگر مگر" اچھے ہیں

اس سا دیدہ ور نہیں کوئی
جس کی "دھی" کے ور اچھے ہیں

ہمت ہے تو چلنے والو
سارے راہ گزر اچھے ہیں

گزرا ہوگا یہ جہلم سے
اس دریا کے بھنور اچھے ہیں

اپنے ملک کی کیا پوچھتے ہو
شہر خراب ہیں گھر اچھے ہیں

قومیں بھٹک گئی ہیں سب کی
سب کے پیغمبر اچھے ہیں

انگریزوں کا دل جیسا ہو
"ریزر" اور "لیزر" اچھے ہیں

شعر اپنے ہیں ایسے ویسے
ہم بس کاریگر اچھے ہیں

لندن' پیرس سے ہمیں اپنے
بھکر اور سکھر اچھے ہیں

(آشیانہ بلبل۔ باؤن ریونیو۔ ہنسلو۔ لندن)
(غلام علی بلبل کے گھر)

شیکسپیر کے اس جملے میں کتنی معنویت ہے کہتا ہے دنیا ایک اسٹیج ہے اری پر ہر انسان اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے شیکسپیر ہمیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ ہم سب اداکار ہیں اور ہمارے اندر ایک اداکار چھپا ہوا ہے

بات یہاں ختم نہیں شروع ہوتی ہے

دیکھنا یہ ہے کاتب تقدیر نے حضرت انسان کو جو کردار ذمہ داری کی صورت میں سونپا اسے اس نے محنت لگن شوق ایمانداری سے نبھایا۔ یا سر سے بوجھ سمجھ کر اتار پھینکا۔

ازل سے ابد تک لازوال کردار کی حامل شخصیات کا شمار ممکن نہیں۔ ستیاب تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسی شخصیات کی تعداد قابل ذکر ہے جن کی ساعی سے دنیا کا حسن برقرار ہے۔

اس کام میں وہی لوگ خود کو فنا کرتے ہیں جو گوشت پوست کے جسم یں زندہ رہنے کو دلوں اور تاریخ میں زندہ رہنے پر ترجیح دیتے ہیں۔

یہ کام ہے انہیں کا جن کے حوصلے ہیں سوا

فنون لطیفہ کے حوالے سے ہم نے بھی ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے س نے پچاس سالہ فنی زندگی میں تھکے ہوئے ذہنوں کو تفریح کے ساتھ تعمیر کے پہلو سے بھی آشنا رکھا۔

طرح طرح کی مشکلات بڑے سے بڑا مالی نقصان بھی اسے اس کی اہ سے نہ ہٹا سکا وہ کل بھی چٹان کی صورت مضبوط اور آج بھی پہاڑ کی مانند اٹل حقیقت ہے زمانے کے حوادث اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے عمر عزیز کے بہترین پچاس سال موسموں کی آگ میں جھونکنے کے بعد بھی نوجوانوں جیسا شوخ بچوں جیسا معصوم ہے۔

زندگی کی رعنائیوں اور قدرت کی نوازشوں کو اس نے دونوں ہاتھوں سے جی بھر کر لوٹا ہے مگر اس سلیقے سے

ہاتھ سے جام بھی نہ چھوٹا رند کے رند بھی رہے

لفظ توازن کو اس شخص نے نئے معنی اور مفہوم عطا کئے اس کی زندگی توازن کا بہترین نمونہ ہے۔ طویل مسافت کے باوجود آج بھی عزت اور شہرت کے نئے باب رقم کر رہا ہے۔

مشرقی روایتوں کے امین پشاور کے متوسط خاندان کا چشم چراغ سادہ اور شرمیلا نوجوان یوسف خان آج ایشیا کا سب سے بڑا اداکار دلیپ کمار ہے۔

بظاہر سادہ اور شرمیلا نظر آنے والا یوسف خان انتہائی زیرک انسان ہے۔ جس نے گلیمر کی دنیا کے بے تاج بادشاہ دلیپ کمار کے سحر میں خود کو گم کرنے کے بجائے دلیپ کمار کو یوسف خان کے طابع کئے رکھا آج بھی دلیپ کمار سب کچھ ہونے کے باوجود یوسف خان کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہ سمانے والا محاورہ دلیپ کمار نے غلط کر دکھایا اگر میں آپ کی ذہانت کا امتحان لیتے ہوئے آپ سے دریافت کروں سید موسیٰ رضا (سنتوش کمار مرحوم) کون تھے رفیع خاور (اداکار ننھا مرحوم)

کیا کرتے تھے یا اللہ رکھی (ملکہ ترنم نور جہاں) کو آپ ضرور جانتے ہوں گے۔ میرے استفسار پر حیران ہو کر آپ میرا منہ دیکھنے لگیں گے کہ میں کن غیر معروف لوگوں کے بارے میں آپ سے دریافت کر رہا ہوں۔ حالانکہ یہ سب لوگ مشہور معروف بھی ہیں اور ہمارا قیمتی سرمایہ بھی۔

یہ حسن اتفاق آپ کو صرف دلیپ کمار کے ہاں ملے گا۔ یوسف خان اور دلیپ کمار میں بلا کی ہم آہنگی اور باہمی ارتباط پایا جاتا ہے دونوں نے ایک دوسرے کی شخصیت کو مسخ کرنے میں توانائی صرف نہیں کی یوسف خان نے دلیپ کمار کو خون جگر پلا کر تناور درخت بنایا تو دلیپ کمار نے یوسف خان کی شناخت کو فخر جان کر سینے سے لگائے رکھا۔ دونوں کے باہمی حسن سلوک نے دلیپ کمار کو فنی معراج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مہذب معاشروں میں Public Figer لوگ ذاتی زندگی میں خود مختار ہوتے ہیں۔ مشرق میں معاملہ الٹ ہے یہاں کی مشہور شخصیات کو اپنی زندگی کے گزارے ہر لمحے کا حساب اپنے پرستار کو دینا ہوتا ہے۔

شو بزنس میں جہاں عزت دولت شہرت ہے وہاں رقابت بھی ساتھ ساتھ ہے بڑے سے بڑا تیس مار خان بھی اس لعنت سے نہ بچ سکا۔

دلیپ کمار کے جہاں بے شمار مداح اور چاہنے والے ہیں۔ وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس بے ضرر انسان کو کانٹوں پر گھسیٹنے سے باز نہیں آتے مگر دلیپ کمار ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔

دانشور کہتے ہیں ایک تولہ لکھنے کیلئے ایک من پڑھنا ضروری ہے دلیپ کمار نے شروع دن سے اس نصیحت کو پلے باندھ لیا وہ کھاتا کم چباتا زیادہ ہے۔ پچاس سالہ فلمی زندگی میں ساٹھ فلمیں ہمارے حساب سے بہت کم دلیپ کمار کے حساب سے کچھ زیادہ ہیں۔

دلیپ کمار کے پیش نظر مقدار نہیں ہمیشہ معیار رہا جسے قائم رکھنے کیلئے دلیپ کمار نے سخت جدوجہد کی اور خود کو اصولوں اور ضابطوں کا پابند بنا لیا کسی بھی کردار کی پیشکش کے وقت خود کو اس کردار میں ڈھالنے کیلئے خاصا غور و فکر کرتا اپنے آپ کو ناموزوں پاکر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر انکار کے ساتھ موزوں اداکار کا نام بھی تجویز کر دیتا۔

مثال کے طور پر فلم اناڑی کے لئے معذرت کرتے ہوئے راج کپور کا نام تجویز کیا "اناڑی" راج کپور کی زندگی کی بہترین فلم ثابت ہوئی۔

قوت فیصلہ قدرت نے دلیپ کمار کو بڑی فیاضی سے عطا کی ہے۔ دنیا کے بیشتر کامیاب انسانوں کی طرح دلیپ کمار کی کامیابی میں اس کے درست اور بروقت فیصلوں کا بڑا دخل ہے۔ بیس سال تک اسکینڈلز کی زد میں رہنے کے باوجود اپنے وقت کی نامور اداکارہ پری چہرہ نسیم کے گھر سے نایاب ہیرے کا انتخاب اور سائرہ بانو سے بروقت شادی نے جہاں لوگوں کو چونکایا وہاں وہ لوگ دلیپ کمار کے اعلیٰ ذوق اور حسن انتخاب کی داد دیتے نہ تھکتے تھے۔

آتے ہی سائرہ بانو نے یوسف خان کا بوجھ بانٹ لیا جس کے ناتواں کاندھے دلیپ کمار کی بھاری بھرکم شخصیت کے بوجھ سے شل ہو چکے تھے سائرہ بانو نے اس بوجھ کے نیچے اپنا کاندھا شامل کر کے دلیپ کمار کو امر اور یوسف خان کو سرشار کر دیا۔

دلیپ کمار جو کام بھی کرے اس میں کمال حاصل کرنا اس کی عادت و مجبوری بن چکی ہے۔ "دیو داس" سے لے کر "سوداگر" تک پردہ سیمیں پر دلیپ کمار کبھی نظر نہ آیا ہمیشہ وہی کردار نظروں کے سامنے رہا جسکا دلیپ کمار نے سوانگ بھر رکھا ہوتا

"میلہ" "آن" "آزاد" "انداز" "دیدار" "دیوداس" "انسانیت" "نیا دور" "گنگا جمنا" "مغل اعظم" "لیڈر" "دل دیا درد لیا" "آدمی" "سنگھرش" "رام اور شیام" مزدور "کرما" اور سوداگر جیسی فلموں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

ان فلموں میں دلیپ کمار نے دل خون جگر چھلنی کر کے زندگی کی عکاسی حقیقت کے نزدیک ترین کی ہے۔

تانگے والے کا کردار ادا کیا تو ہفتوں نہیں مہینوں تانگے والے کی شاگردی کئے رکھی شرابی کا رول ادا کیا تو شراب خانے کو مکتب جان کر اس کے انداز و اطوار سیکھے۔

ایک الزام دلیپ کمار پر ہر دور میں تواتر سے لگتا رہا آج بھی لوگ اس کی راکھ سے چنگاری تلاش کرتے نہیں تھکتے خود دلیپ کمار اس موضوع پر ایک لفظ کہنا مناسب نہیں سمجھتا یعنی اس مسئلے پر وہی معاملہ ہے۔

زمین جنبد نہ جنبد گل محمد

لوگوں کا کہنا ہے دلیپ کمار بہت عاشق مزاج ہے اور غیر سنجیدہ بھی تبھی اس کے تمام عشق ناکام ہوئے دلیپ کمار کے غیر ذمہ دارانہ رویئے سے بہت سے نازک دل درد سے تلملا اٹھے وغیرہ وغیرہ

دلیپ کمار آئندہ بھی اس مسئلہ پر شاید زبان نہ کھولے ہم ضرور کچھ کہنا چاہیں گے جو توجہ کے لائق ہے۔

نوجوانی میں دلیپ کمار سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا رومانی ہیرو ہوا کرتا تھا۔ دلیپ کمار نے ایسے ایسے رومانوی کردار ادا کئے اگر مجنوں رانجھا یا فرہاد بھی اس دور میں زندہ ہوتے تو شوق سے اسے اپنا استاد تسلیم کر لیتے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے دلیپ

ار ریاضت ضروری سمجھتا ہے جنہیں دنیا ناکام عشق کہتی یا سمجھتی ہے ہو
تا ہے وہ دلیپ کی ریاضت کا حصہ ہوں۔

قدرت نے حضرت انسان کا خمیر آگ مٹی اور پانی سے بنایا ہے جس
ں خیر کے ساتھ شر کا پہلو بھی موجود ہے لہٰذا میں دلیپ کمار کو تمام الزامات
ے بری الذمہ نہیں گردان رہا البتہ یہ ضرور عرض کروں گا مجنوں کو لیلیٰ کے
ق میں نمازی نظر نہ آیا اللہ کے عشق میں غرق نمازی کو مجنوں کیسے نظر
یا آپ دلیپ کمار کو ان الزامات سے بری نہ بھی کریں۔ سزاوار بھی نہیں
را سکتے دلیپ کمار نے تاریخ میں بطور اداکار جو مقام وقف کر لیا ہے اس
ے انکار مشکل اقرار آسان ہے کسی بھی قسم کی بشری کوتاہی اس کے فن کی
ہ یا پہچان نہیں بن سکتی بلکہ کسی بھی بڑے فنکار کی پہچان نہیں بن سکتی
م تر بشری کوتاہی اور لغزشوں کے باوجود دلیپ کمار عظیم اداکار ہے مداحوں
ے ساتھ ناقدین بھی یہ اقرار کرتے نہیں تھکتے یہ ہی اس کے عظیم ہونے
دلیل ہے۔

عشق اور مشک کی طرح خالص پٹھان بھی چھپائے نہیں چھپتا جس طرح
پ کے والد نے بیٹے کی فلم دیکھ کر اسے اس کی محبوبہ (فلمی) سے شادی
اجازت کے ساتھ اسے اٹھالانے کا مشورہ بھی دے ڈالا تھا اسی طرح
پ کمار نے ایک فلم کے جذباتی سین میں فلم کی ہیروئن کو اصلی تھپڑ دے
جس سے یہ فلم خاصے دن ڈبوں میں بند پڑی رہی۔

ایک بڑے فلمساز اسٹوڈیو مالک کی فلم میں کام کرنے سے بوجہ مصروفیت
ر کر دیا البتہ چائے کی دعوت رد نہ کر سکا۔ دوران چائے اسٹوڈیو میں آگ
ب اٹھی۔ دلیپ کمار گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ فلمساز مذکور اطمینان سے خود بھی
ے پیتا رہا اور دلیپ کمار کو بھی یہ کہہ کر اطمینان دلایا صاحب جن کا کام
آگ بجھانا وہ کوشش کر رہے ہیں میں یا آپ کیا کر سکتے ہیں۔

پٹھان بچہ فلمساز کی اس بہادری پر اتنا خوش ہوا از خود کنٹریکٹ منگوا کر
سائن کر دی۔

انسانی جذبوں کا دلیپ کمار بہت احترام کرتا ہے کسی مجبوری کے تحت
ب فلم کے سیٹ پر تاخیر سے پہنچا سیٹ پر موجود ٹیکنیک کار انتظار کی
ت سے مضمحل دکھائی دیتے تھے۔ دلیپ کمار نے اس دن کا سارا خرچ
ہ ذمے لے کر شوٹنگ یہ کہہ کر کینسل کرا دی کہ یہ لوگ اب تخلیقی کام
ں کر سکیں گے۔

عظمت کی ایک مثال سنتے چلئے ذاتی پروڈکشن کے دوران ایک شخص کی
ت واقع ہو گئی اس کی بیوہ کو بہن بنا کر اس کے خاندان کی کفالت کا ذمہ
کیلئے اپنے سر لے لیا خود بعد میں کھایا انہیں پہلے کھلایا۔

مدمقابل کو مرعوب کرنے کی صلاحیت بھی خداداد ہے فلم آدمی کی
شوٹنگ کے دوران ایک سین میں اس غضب کی اداکاری کی منوج کمار جیسا
حشت پہلوادا کار اپنی اداکاری بھول کر دلیپ کمار کی اداکاری میں اتنا محو ہوا کہ
باری پر اپنے مکالمے بھی ادا نہ کر سکا۔

خاندانی حقوق و فرائض کی ادائیگی کے علاوہ سماجی اور فلاحی خدمات کی
طویل فہرست میرے سامنے ہے۔ ذکر اس لئے نہیں کرونگا بقول دلیپ یہ
سب کچھ وہ اپنے رب کی خوشنودی کے لئے کرتا ہے نمود و نمائش سے اس
طرح خوف کھاتا ہے جیسے گنہگار شخص ملک الموت سے۔

اس بیدار مغز انسان کو سیاست کے خارزار میں گھسیٹنے کی بڑی کوشش
کی گئی جس میں ہر قسم کی ترغیبات بھی شامل تھیں سب بے سود۔ فلمی دنیا
کی چکاچوند سے مات نہ کھانے والا سیاست کی حشر سامانیوں سے بھی مرعوب
نہ ہو سکا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوانے کیلئے بمبئی جیسے تضادات سے
پور شہر کا شیرف بن کر لوگوں کا منہ بند کیا اور گھر کی راہ لی۔

سیاست کی بے رحم وادی سے دامن بچانا دلیپ کمار کی تاریخی عقلمندی
شمار ہو گی۔ پشاور کی بوسیدہ عمارتوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں وقت
گزاری کو ترسنے والے اس خوش قسمت انسان نے اپنے دونوں روپ اس
طرح سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جس طرح کنواری کنیا اپنا جوبن سنبھال کر
سنوار کر رکھتی ہے۔ مستقبل میں بھی دلیپ کمار سے اسی بردباری اور
وسعت نگاہ کی امید بے جا نہ ہو گی طویل اور پر پیچ مسافت کامیابی سے جاری
رکھنے پر ہم دلیپ کمار کو مبارکباد کے ساتھ دعاؤں کا مستحق سمجھتے ہیں۔

دلیپ کمار کا سفر ابھی جاری ہے۔ یوسف خان کی بردباری دلیپ کمار کی
دور اندیشی ماضی اور حال کی طرح مستقبل تابناک بنانے میں پیش پیش ہوں
گی۔ ایک مضمون تو کیا ایسے بہت سے مضمون مل کر بھی دلیپ کمار کی سحر
انگیز شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتے اس کے لئے سخت محنت اور لگن کے
ساتھ بہت کام کرنا ہو گا جس میں دشوار مقام بھی یقیناً آئیں گے ان
دشواریوں کو پاٹ کر ہی ہم دلیپ کمار کا قرض ادا کر سکیں گے جو ہم پر قرض
ہے۔ سائرہ بھابھی خوش نصیب ہے جسے بائیس سال کی عمر میں چوالیس سالہ
سرد گرم چشیدہ دلیپ کمار کی رفاقت میسر آئی۔ ورنہ روشنیوں اور ہنگاموں
کی اس نگری میں کب کون اتنی دور کسی کے سنگ چلا ہے۔ قسمت سے گر
چلا بھی جائے تو اس شعر کے مصداق۔

کوچہ جاناں میں ہم بھی تھے رقیب بھی تھا
ہم ترستے رہے اور وہ بامراد ہوا

ملاقات

عارف رانا اور فریدہ رانا کے ساتھ

احمد ہاشمی

دوران گفتگو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی دانشور فلسفی یا مفکر سے مخاطب ہیں ان دونوں میاں بیوی کی گفتگو میں لفظوں کا مناسب استعمال آواز کا زیر و بم اور محبت کی چاشنی نے ماحول کو تکلف کے لوازم سے آزاد کر دیا تھا آپ کی سہولت کے لئے بتاتے چلیں یہ مثالی جوڑا پاکستان ٹیلی ویژن کے دو ممتاز ترین پروڈیوسر عارف رانا ور فریدہ رانا ہیں۔

عارف رانا نے سید ضمیر جعفری کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا کہ (جہاں سید ضمیر جعفری، گلزار جاوید اور احمد ہاشمی ان کے منتظر تھے) ہم تو اس گھر کے آگے سے تین مرتبہ گذرے اور ہر بار یہ سوچ کر آگے بڑھ گئے کہ ضمیر جعفری صاحب کے گھر کا نام "کاشانۂ

ڈرامہ پی ٹی وی کی پہلی ذمہ داری نہیں

بلبل" نہیں ہو سکتا درست ہی کہا آپ نے میرے تن و توش کی مناسبت سے تو اس کا نام "کاشانۂ ہاتھی" ہونا چاہیے تھا سید ضمیر جعفری کے اس جملے پر زور کا قہقہہ پڑا

سید ضمیر جعفری نے اپنے دوست غلام علی بلبل (مزاح گو شاعر) کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ بھی سنایا۔ بولے پچاس کی دہائی میں بلبل صاحب کی ملازمت کے سلسلے میں زیڈ۔ اے بخاری صاحب کے پاس گیا۔ بخاری صاحب نے تڑسے کہہ دیا بلبل نام کے شخص کو کبھی نوکری نہ دوں۔ اس بے تکلف گفتگو کے دوران مشروبات اور چائے کے وقفوں میں کچھ سنجیدہ گفتگو بھی ہوئی

سوال: کیا ٹی وی سے آپ دونوں کی زیادہ ہم آہنگی تھی؟ اس میں شمولیت کا خیال کیسے آیا۔

عارف رانا: ذہنی ہم آہنگی کا سوال تو اس لئے نہیں آتا کہ 1968ء میں ٹیلی ویژن بطور کلچرل میڈیا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ شوق تو قانون کی ڈگری لے کر وکیل بننے کا تھا۔ جاب کی تلاش میں ٹیلی ویژن پر کوشش

عارف رانا ترکی کی اداکارہ نازاں ساچی کے ساتھ

کی اور سلیکشن ہو گئی۔

فریدہ رانا: میرا ذہن اس طرف کچھ راغب تھا۔ 1980ء میں ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں نے کوشش کی اور ٹی وی جوائن کر لیا۔

سوال: آپ دونوں ایک دوسرے کی پروڈکشن پر تنقید کرتے ہیں یا تعریف؟

فریدہ رانا: (ہنستے ہوئے) جہاں اچھی بات پر تعریف کرتی ہوں وہاں خامیوں کی نشاندہی بھی کرتی ہوں۔ ایسا بھی ہوا کہ عارف نے میری غلطی کی نشاندہی کی اور مجھے غصہ آگیا اور میں نے عارف کو کہہ دیا کہ تم ہیڈ آفس سے ملے ہوئے ہو۔

عارف رانا: (مسکراتے ہوئے) ساتھی پروڈیوسر کی حیثیت سے ٹی وی کے بہت سے معاملات پر مشاورت کرتے ہیں۔ جس میں اتفاق بھی ہوتا ہے اور اختلاف بھی۔

سوال: زندگی کے ایک ہی شعبے سے میاں بیوی کا تعلق دلچسپی کا باعث ہے یا بوریت کا

دونوں (ہم آواز ہو کر) ہمارے لئے تو دلچسپی اور مسرت کا باعث ہے۔ بوریت کا احساس کبھی نہیں ہوا۔

سوال: گھریلو زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ آپ دونوں میں سے گھر کا حاکم کون ہے۔

فریدہ رانا لیڈی ڈیانا سے ہاتھ ملاتے ہوئے

عارف رانا: (ہنستے ہوئے) ایک دم بہترین حاکم محکوم کا کوئی تصور نہیں۔

فریدہ رانا: گھریلو زندگی پر سکون ہے۔ اختلاف بھی ہوتا ہے چوڑیوں، کپڑوں اور میک اپ پر نہیں بچوں کی پرورش اور تربیت پر

سوال: فریدہ اگر آپ پروڈیوسر نہ ہوتیں تو آپ کا عارف سے یہ ہی سلوک ہوتا۔

فریدہ رانا: واقعی مسئلہ بن جاتا۔ اب صورتحال زیادہ بہتر ہے۔ عورت کے احساسات و جذبات حالات و واقعات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ضرورت اور خواہشات کے تقاضے عورت کے احساسات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سوال: ہمارے معاشرے میں عورت کا کام کرنا مجبوری ہے یا زندگی کے لئے ضروری

فریدہ رانا: عورت کا کام کرنا زندگی کی ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ عورت کو عضو معطل نہیں بننا چاہئے۔ وقت کے تقاضے بدل رہے ہیں، حالات بدل رہے ہیں۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں عورت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔

سوال: دوپٹے کے حوالے سے آپ کا اور ٹی وی کی دیگر خواتین کا رد عمل کیا ہے۔

فریدہ رانا: پروڈیوسرز کی حد تک دوپٹہ چوائس میں شامل ہے۔ دوسری خواتین بھی اس کی عادی ہو گئی ہیں۔ دوپٹہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ ایک مسلمان پاکستانی کی حیثیت سے ہمیں اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت کرنی چاہئے۔

عارف رانا: دوپٹہ ہماری شناخت ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ اور قومیں جن کی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ ڈرامے کا مسئلہ مختلف ہے۔ کردار کے حوالے سے اس کے لوازمات کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔

سوال: پی ٹی این کے قیام کے بعد سے پی ٹی وی کو خسارے کا سامنا ہے۔

عارف رانا: خسارے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں ایک وجہ مہنگائی کے

نقاد T.V ڈرامے کو ادب میں شامل نہیں کرتے

سبب پروڈکشن کی لاگت میں اضافہ بھی ہے۔ خسارہ تو تب ہو کہ دس روپے آمدن کی توقع ہو اور آمدن نو روپے ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے PTN کا کوئی مقابلہ نہیں کیونکہ پی ٹی وی کے پیش نظر کمائی نہیں۔ مشن کی تکمیل ضروری ہے۔ ہم ڈرامے اور موسیقی کے ساتھ معلوماتی، علمی، ادبی اور مذہبی پروگرام کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ مذہبی اور سائنسی حوالے سے عوام کو ایجوکیٹ کرنا۔ قومی شعور کو اجاگر کرنا اخوت اتحاد اور حب الوطنی کو فروغ دینا پاکستانی ٹیلی ویژن کی اولین ترجیحات ہیں۔ پی ٹی این تو ویڈیو شاپ ON AIR ہے۔ ہم ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرتے ملکی ترقی کے لئے اور نیٹ ورک بھی شروع ہونے چاہئیں۔ تجارت اور مشن کا فرق ضرور پیش نظر رکھیں۔

سوال: پروڈیوسرز پر گروپ بندی کا الزام کس حد تک درست ہے۔

عارف رانا: پروڈیوسر بھی آخر انسان ہے۔ ذاتی پسند نا پسند تو ہو سکتی ہے۔ باقاعدہ گروپ بندی کا الزام ہم تسلیم نہیں کرتے

سوال: پی ٹی این(P T N) کی موجودگی میں پی ٹی وی (P T V) اظہار رائے پر پابندیاں کب تک برقرار رکھ سکتا ہے۔

عارف رانا: پہلے تو ہمیں اظہار رائے کا تعین کرنا ہو گا۔ لفظ کی اپنی ایک حرمت ہوتی ہے۔ کوئی شخص گالی دینے کو اظہار رائے سمجھے۔ پی ٹی وی اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے۔ مثبت انداز میں

کرتا ہے۔ جس کی ہمیں مکمل آزادی ہے۔ ہر تیسرے مہینے ہماری میٹنگ ہوتی ہے۔ جس میں ہمیں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔

سوال: کسی مرحلے پر پی ٹی وی پرائیویٹائزیشن کی زد میں آگیا تو اس کا معیار کیا ہو گا۔

عارف رانا: پہلے تو یہ دیکھیں کہ ہمارا اب معیار کیا ہے۔ میرے خیال میں پاکستان ٹیلی ویژن کا مقام تخلیق کار کا ہے۔ تخلیق کار اپنی تخلیق کے ساتھ ہر حال میں انصاف کرتا ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کا معیار انشاء اللہ بہتر ہو گا کم نہیں۔

سوال: ڈرامے کے علاوہ بھی صلاحیتوں کو منوایا جا سکتا ہے۔ بیشتر پروڈیوسر ڈرامے کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں۔

عارف رانا: پروڈیوسر کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ خود میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ میں نے نیلام گھر سے شہرت پائی۔

فریدہ رانا: سلیم طاہر کی مثال لے لیں انہوں نے معاشی پروگرام سے شہرت پائی۔

PTN ویڈیو شاپ On Air ہے

عارف رانا: جی بالکل سلیم طاہر نے خشک موضوع پر محنت کی عوام نے اسے بے حد سراہا محنت جہاں بھی کی جائے صلاحیت جہاں بھی ہو اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ ڈرامہ زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید کچھ لوگ ڈرامے کو آسان سمجھتے ہوں مگر ضروری نہیں ہر پروڈیوسر ڈرامے میں کامیاب رہے۔ بے شمار ڈرامہ پروڈیوسرز میں سے چند کو ڈرامے کی وجہ سے شہرت ملی۔ مثلاً شہزاد خلیل 'کنور آفتاب' محمد نثار حسین یاور حیات وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ویسے بھی ڈرامہ ٹیلی ویژن کی پہلی ذمہ داری نہیں بیشتر پروڈیوسر نے موسیقی میں بڑی جدت پیدا کی۔ غزل کی گائیکی کو دیکھیں ٹی وی نے غزل کی گائیکی کو اتنا منفرد رنگ دیا کہ فلموں میں بھی غزل گائی جانے لگی۔ قومی نغموں کو لیجئے یہ روایت بھی ٹیلی ویژن نے ڈالی یہ نغمے اس قدر مقبول عام ہوئے کہ اس سے حب الوطنی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔

سوال: ٹیلی ویژن کے پروگرامز میں دیہی زندگی کی عکاسی نسبتاً کم ہے۔ ٹیلنٹ کی کمی ہے یا وسائل کی۔

عارف رانا: وسائل اور ذرائع کی کمی نہیں ہم پاکستان کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو اس میں دیہاتی کلچر ضرور آتا ہے۔ آپ ہمارے پروگرام دیکھیں اس میں سرحد پنجاب سندھ بلوچستان کی پوری نمائندگی ملے گی۔ فنکار اور ٹیلنٹ اگر ہمیں اپروچ نہ کر سکیں تو ہم خود انہیں تلاش کرتے ہیں۔

سوال: جب دیہاتی بچے ٹی وی پر شہری کلچر دیکھتے ہیں تو کیا احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے۔

عارف رانا: ٹیلی ویژن کی نشریات اور سڑکوں کی تعمیر نے اس فرق کو کافی حد تک کم کیا ہے۔ شہری کلچر کے ساتھ دیہی کلچر کو اجاگر کرنے کے لئے ہم آوٹ ڈو شوٹنگ پر خاص توجہ دیتے ہیں

سوال: فریدہ آپ بچوں کے پروگرام زیادہ کرتی ہیں یہ تجربہ خاتون ہونے کے ناطے کیسا رہا۔

عارف رانا گیسٹ ہاؤس کی ٹیم کے ساتھ

فریدہ رانا: بچوں کے پروگرامز کرنا دلچسپ بھی ہے اور دشوار بھی بچوں کے معصوم سوالات کا جواب دینا مشکل ہوتا ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات مختلف ہوتی ہے۔ ان کو ان کی سطح پر آ کر ڈیل کرنا پڑتا ہے ۔بچے بڑے بولڈ ہوتے ہیں تاخیر کی صورت میں بھی آپ کو ان کے طرح طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لباس کی درستگی سے لے کر نیچی بدلنے تک کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

سوال: پی ٹی وی اکیڈمی میں پروڈیوسرز کے ساتھ اداکاروں کی تربیت کا انتظام نہ کرنا پی ٹی وی کی کوتاہی یا غفلت نہیں۔

عارف رانا: اصل میں یہ پی ٹی وی کی نہیں کلچر منسٹری کی ذمہ داری بنتی ہے۔ اداکاروں کی ضرورت صرف پی ٹی وی کو نہیں ریڈیو اور اسٹیج کو بھی ہوتی ہے۔ پی ٹی وی نے اپنے اسٹیشن کو اکیڈمی کا درجہ دے کر فنکاروں کی تربیت کا فریضہ باخوبی انجام دیا ہے۔ دیگر چینل ہمارے ہی تربیت یافتہ اداکاروں سے کام چلا رہے ہیں۔

سوال: اداکاروں کے حوالے سے یہ فرمایئے معاوضے کی کمی کا شکوہ بجا

ہے کیا۔

عارف رانا: کسی حد تک کہہ سکتے ہیں بہت کم نہیں دراصل ریڈیو ٹی وی ملکی مفاد میں کام کرنے والے ادارے ہیں اس لئے صورت حال یقیناً بہتر ہے۔

سوال: جس رفتار اور مقدار سے پی ٹی وی ایوارڈ تقسیم کئے جا رہے ہیں اس سے کیا پی ٹی وی ایوارڈ کی اہمیت کم نہیں ہو رہی۔

عارف رانا: ہر سال ایوارڈ دینے کا سلسلہ ملتوی کر دیا گیا ہے پچھلی مرتبہ سے درخواست کرتے رہے ہیں مگر ان لوگوں کی اپنی مصروفیات ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ٹیلی پلے لکھنا ہی نہ چاہتے ہوں۔ ویسے بھی "نقاد ٹی وی ڈرامے کو ادب میں شامل نہیں کرتے"

سوال: پاکستانی فنکاروں خصوصاً ٹی وی فنکاروں کا غیر ملکی پروڈکشن میں کام کرنا ملکی مفاد میں ہے کہ نہیں۔

عارف رانا: فن اور فنکار کو جغرافیائی حدود میں مقید کرنا ناانصافی ہو گی۔ فنکار ملک میں بھوکا مرے تو کسی کو پروا نہیں ہوتی۔ باہر جا کر مقام پیدا

خوش نصیب ہیں وہ لوگ اور قومیں جنکی اپنی شناخت ہوتی ہے

سلور جوبلی کی تقریب تھی اور 25 سال میں مختلف شعبوں کی کارگردگی کا احاطہ کیا گیا تھا اس وجہ سے آپ کو زیادہ لگے۔

سوال: پاکستان ٹیلی ویژن ملک کے بڑے افسانہ نگاروں کو لکھنے کی دعوت کیوں نہیں دیتا۔

عارف رانا: پاکستان ٹیلی ویژن نے کسی کو لکھنے سے منع نہیں کیا سب کر لے تو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ ملکی اور قومی وقار کو پیش نظر رکھ کر غیر ملکی پروڈکشن میں کام کرنا باعث عزت بھی ہے اور باعث فخر بھی۔

تین گھنٹے کی اس دلچسپ نشست کا اختتام فریدہ رانا کے یہ یاد دلانے پر ہوا کہ عارف نے دوائی کھانی ہے۔ کیونکہ عارف رانا گذشتہ رات سے فلو میں مبتلا تھے۔ جس کا انھوں نے دوران گفتگو ذکر تک نہ کیا۔

قلمے وکتابے

کتاب کا نام:۔ "درون روس"

مصنف :۔ حکیم محمد سعید صفحات:۔ 360

قیمت:۔ 125روپے

پبلشر۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی

مبصر گلزار جاوید

حکیم محمد سعید صاحب (بانی ہمدرد فاؤنڈیشن) کا شمار ملک کی چند ممتاز ہمدرد ملت شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ طب، تعلیم، ادب اور انسانی ذہن و ضمیر کی بیداری میں ان کی خدمات روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کا احاطہ کرنے کے لئے کئی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ایک مصنف کی حیثیت سے بھی وہ اپنی منفرد چھاپ رکھتے ہیں اب تک ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکل چکی ہیں سفرنامہ بالخصوص اردو ادب کی زرخیزی اور سربلندی کا موجب ہیں۔ "درون روس" ان کا تازہ سفرنامہ ہے۔ یہ جہاں ادبی لحاظ سے ایک اعلیٰ درجے کی تخلیقی دستاویز ہے۔ وہاں اس کی وساطت سے قاری عہد حاضر کے بعض اہم عمرانی سیاسی اور تہذیبی مسائل کا درک و شعور بھی حاصل کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی فراست کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے کئی برس پہلے اشتراکی روس کی دیواروں میں پڑتے ہوئے شگافوں کی نشان دہی کر دی۔

☆--------------☆

نام کتاب= سیف الملوک۔ مصنف= میاں محمد بخش

ترجمہ اور مقدمہ= شفیع عقیل۔ صفحات= 504، قیمت= 150

ناشر= انجمن ترقی اردو پاکستان۔ مبصر= سید ضمیر جعفری

شفیع عقیل اس دور کے محض ایک اہم ادیب ہی کا نام نہیں ہمارے عوامی ادب میں روشنی کے ایک مینار کا بھی نام ہے۔ بے شک اس کی اپنی تخلیقات بھی ہمارا گراں قدر تہذیبی سرمایہ ہیں لیکن جس محنت استقامت ذہانت اور محبت کے ساتھ وہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے فکری اور لسانی ورثے کو اردو میں منتقل کر رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا شمار اس عہد کے ان چند دانشور تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کے ذہن و قلم سے ہمارا قومی ادب اپنی "پاکستانی شناخت" پیدا کر سکا ہے۔

اس کے تراجم کمال فکر اور جمال فن کے لحاظ سے کتنی ہی تحسین و تکریم کے مستحق کیوں نہ ہوں بے شک طلبہ کے لئے تحقیق و تلاش کی راہیں کھولنے والے بھی ہوں (اور یقیناً ہیں) لیکن میرے نزدیک وہ اپنے جانکاہی کے اس عمل سے صدیوں پر پھیلے ہوئے اس تہذیبی ڈیلٹے میں آباد مختلف نسلوں کے لوگوں کو ذہنی و تمدنی لحاظ سے "قومیانے" کا کٹھن مگر ضروری کردار انجام دے رہا ہے۔ وہ ملک کی پیلی پیاسی جلی کٹی مٹی کے سنہرے ذروں کو رتی رتی چھان پھٹک کر ان کو اپنے دریاؤں کے پانیوں سے "شرار شکار" کر وطن کی پیشانی کے لئے پارے کے سونے کے جھومر ڈھال رہا ہے۔

پنجابی زبان کے عظیم صوفی شاعر حضرت میاں محمد بخش (عارف کھڑی) کی غیر فانی مثنوی "سیف الملوک" کو پنجابی شاعری میں فکری کشش اور جذباتی مقبولیت میں وہی مقام نصیب ہوا ہے جو فارسی شاعروں میں مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کو حاصل ہے۔ پنجابی ادب کے اس عظیم و ضخیم کلاسیکی شاہکار کا اردو ترجمہ اور ایک سانولا سلونا ترجمہ شفیع عقیل کے توانا اور ہمیشہ بار قلم کا ایک اور کارنامہ ہے جس کی چاندنی جیسا کہ میں نے پہلے کہنے کی کوشش کی کراچی سے لنڈی کوتل تک دلوں کے فاصلوں کو کم کرتی چلی گئی ہے۔

☆--------------☆

کتاب کا نام:۔ خان بہادر سید جعفر حسین

مصنف کا نام:۔ پروفیسر حسن سجاد

صفحات :۔ 85

مبصر : احمد ھاشمی

یہ کتاب خان بہادر سید جعفر حسین کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ خان بہادر سید جعفر حسین پاکستان آرمی کے نامور دانش ور جرنیل سید شاہد حامد کے دادا تھے۔ انہوں نے تحریک علی گڑھ کی نشوو نما میں پس منظر میں رہ کر جو تابندہ ملی خدمات انجام دیں تھیں اس کتاب میں ان گرانقدر خدمات کی کہانی کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ علی گڑھ کی تحریک دراصل پاکستان کی تحریک کا پیش خیمہ تھی اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تحریک پاکستان کو سمجھنے کے لئے علی گڑھ کی تحریک کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک فرد کی حکایت حیات نہیں بلکہ برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی حیات اجتماعی کی داستان ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ------

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اندھیرے سویرے

احمد ھاشمی

نصرت فتح علی

قوالی میں منفرد اسلوب کے گائیک نصرت فتح علی کے فن اور شخصیت کے بارے میں ایک تفصیلی فیچر اور سرورق پر بین الاقوامی شہرت کے حامل اس فن کار کی رنگین تصویر چھاپ کر رسالہ "قومی ڈائجسٹ" نے ادب و فن کی زندہ دوستی کی ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ روداد ملاقات جناب ستار طاہر نے لکھی ہے اور ان کے انوکھے طرز تحریر کی خوبیوں سے آراستہ ہے۔

☆-------------☆

ظہور راجہ کی علالت

ظہور راجہ جن کو 1940ء کی دہائی میں برصغیر کے خوبصورت ترین ہیرو کا امتیاز حاصل رہا جن کی فلم انمول گھڑی نے ہندوستانی کی صنعت فلم سازی کو ایک نئی سمت عطا کی اور جوہو (بمبئی) میں جن کے اصطبل میں ریس کے بائیس گھوڑوں کا دستہ موجود رہتا تھا۔ ان دنوں لندن کے علاقہ کراشن میں تشویش ناک طور پر علیل ہیں اردو اور پنجابی زبان کے معروف شاعر افضل پرویز صاحب نے جو ڈینیز ہائی سکول راولپنڈی میں ظہور راجہ کے ہم سبق رہے ہیں اپنے بھانجے کو اپنے دوست کی تیمار داری کے لئے لندن روانہ کیا ہے۔ کیونکہ زندگی میں مختلف اوقات میں سترہ عورتوں سے شادیاں کرنے والے اس خوبصورت ہیرو کے پاس اب نہ کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی اولاد ظہور راجہ کا تعلق کوہ مری کے ایک ممتاز راجگان خاندان سے تھا۔ سورن لتا اور مینا کماری جیسی پری چہرگان ایک وقت میں ان کے حرم کی زینت تھیں۔

☆-------------☆

ڈوبتا دو اختران ادب کا

ڈاکٹر اختر رائے پوری اور سید اختر حسین جعفری کے یکے بعد دیگر جلد جلد رحلت اردو ادب کے سانحے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر رائے پوری ان محدود سے چند اہل قلم میں سے تھے، جنہوں نے اردو میں کہانی کی صنف کو ایک حقیقت پسندانہ رومانیت سے آشنا کیا۔ اور نقاد و تحقیق کے شعبوں میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ ان کی خود نوشت سرگزشت حیات جو چند برس پہلے ماہنامہ "افکار" کراچی میں شائع ہوتی رہی ان کی زندگی کا آخری یادگار کارنامہ تھا۔ شائد بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر اختر رائے پوری کے بڑے بھائی ناظر حسین شمیم جو ایک طویل مدت تک لاہور میں مقیم رہے۔ اردو کے صاحب طرز ادیب مولانا چراغ حسن حسرت کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور اس واسطے سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی مراحل میں مولانا حسرت کا فیضان توجہ بھی حاصل رہا۔

سید اختر حسین جعفری ابھی جواں سال تھے

انہوں نے نظم میں اپنے نہایت تازہ و توانا دلکش اور خیال انگیزی لہجے سے اردو کی جدید نظم کی صورت اور سیرت کے رنگ و آہنگ میں جو اضافے کئے ہیں ان پر نقادان ادب ابھی خیرگی کے عالم میں تھے کہ ستارہ اچانک موت کی لقاء تاریکی میں اتر گیا۔

سید اختر حسین بلاشبہ ان غیر معمولی ذہین تخلیق کاروں میں سے تھے جن کے بارے میں کسی تردید یا خوف کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ----- "وہ آیا" اس نے دیکھا اور فتح کر لیا ------ اختر حسین جعفری کی رحلت سے اردو شاعری ----- کیٹس کی عمر میں باکرن سے محروم ہوگئی۔

☆-------------☆

پوٹھوار کی دو بزرگ شخصیتوں کی رحلت

سال رواں کی پہلی سہ ماہی میں جناب چوہدری مولا داد چوہان اور جناب میاں حیات بخش کی رحلت سے علاقہ پوٹھوار اپنی دو ایسی ممتاز بزرگ شخصیتوں کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں سے محروم ہوگیا ہے جنہوں نے اپنے اپنے دائرے میں اس علاقے کی سماجی، فلاحی، تعلیمی اور تمدنی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ ہم عمر بھی تھے۔ دونوں نے 92برس کی عمر پائی۔

چوہدری مولا بخش چوہان راولپنڈی شہر کے ایک قدیم سربرآوردہ چوہان خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ راولپنڈی شہر کا مشہور محلہ "وارث خان" انہی کے جد امجد کے نام سے موسوم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد چوہدری مولا داد پہلے مسلمان تھے جو بلدیہ کے صدر منتخب ہوئے اور طویل

مدت تک اس منصب پر فائز رہے۔ وہ ایک خوش گفتار، خوش اخلاق ادب نواز شخصیت، بہادر شکاری، مجلس طراز انسان تھے۔ پنجابی کے صوفی شعراء کے سینکڑوں اشعار ان کو زبانی یاد تھے۔ خود بھی پنجابی کے اچھے شاعر تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے ان کی بیٹھک میں زندگی کا میلہ بھرا رہا۔

میاں حیات بخش مرحوم کی زندگی کردار و عمل میں اعلیٰ اسلامی اقدار کا نمونہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو مسلمانوں کی بہبود بلکہ تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے وقف رکھا۔ قائد اعظم کی آواز پر جن چند زعما نے پوٹھوار کے علاقہ میں پاکستان کے علم کو بلند کیا اور اس مقصد کے لئے سینہ سپر رہے ان میں میاں حیات بخش ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ساجی بہبود ان کی زندگی کا خصوصی مشن تھا۔ انجمن فیض الاسلام کے وسیلے سے وہ بے آسرا مسلمان بچوں کی باوقار اور بامقصد تعلیم و تربیت کا جو چشمہ فیض جاری کر گئے ہیں اس کی برکات سے آنے والی نسلیں مستفید ہوتی رہیں گی اور ایک احسان مند قوم ان کو "پوٹھوار کے سرسید احمد خان" کے نام سے یاد کرتی رہے گی۔ ان دونوں بزرگوں کی رحلت سے راولپنڈی کی ساجی تاریخ کا ایک زریں دور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ ادارہ "چہار سو" دونوں بزرگوں کے پسماندگان کی خدمت میں بہ صمیم قلب تعزیت پیش کرتا ہے۔

ظفر مہدی میموریل کلچرل سوسائٹی کا جشن بہار مشاعرہ

ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی کا نواں سالانہ مشاعرہ موورخہ سولہ مئی کو مین ہٹن کے ایک مقامی اسکول میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں خاص بات یہ تھی کہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا اور سوا بارہ بجے ختم ہوا۔ اس طرح سامعین جو کئی سال سے مشاعروں کی انتظامیہ کے بارے میں شاکی رہتے تھے کہ وقت کی پابندی نہ کرنے سے بہت سے لوگوں کو بوریت اور کوفت سے گزرنا پڑتا تھا، اس کے بجائے ایک خوبصورت شام انہوں نے گزاری اور پاکستان سے آئے ہوئے مشہور شعراء کو جی بھر کے سنا۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ اس میں تمام مقامی شعراء میزبان کی حیثیت سے شریک تھے مگر انہوں نے کلام نہیں سنایا تاکہ مہمانوں کے کلام سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوا جاسکے۔ ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی گزشتہ نو سال سے سالانہ مشاعرے، نثری محفلیں منعقد کرتی رہی ہے۔ اس کے اراکین میں مامون ایمن، حمیرا رحمان، زاہد سعید زاہد، حامد علی خان اور ظفر نقوی نمایاں ہیں۔ تقریب کی کامیابی اور تنظیمی عناصر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوسائٹی بڑے منظم انداز میں اردو ادب کی خدمت اور فروغ کی تمامتر سرگرمیوں میں کوشاں ہے۔ مہمان شعراء میں جناب عارف عبدالمتین، جناب شبنم رومانی، جناب حفیظ تائب، جناب محسن بھوپالی، جناب محسن احسان، **جمال** پانی پتی، جناب رشید وارثی نے پاکستان سے، جناب نسیم زیدی نے واشنگٹن سے، جناب سرمد اقبال نے بوسٹن سے، جناب اشفاق نے کینیڈا سے خصوصی طور پر شریک ہو کر سامعین کو اپنے کلام سے فیض یاب کیا۔ صدارت جناب عارف عبدالمتین نے کی اور نظامت کے فرائض معروف شاعر اور ظفر زیدی سوسائٹی کے ناظم اعلیٰ جناب زاہد سعید نے بخوبی انجام دیئے۔ اس مشاعرے میں ساڑھے چار سو سامعین نیویارک اور اس کے گردونواح سے تشریف لائے۔ ٹکٹ صرف پانچ ڈالر رکھا گیا تھا جس سے ظفر زیدی سوسائٹی کے اس عزم کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام ممکنہ طریقوں سے اردو کو اس کے چاہنے والوں میں مزید عام کرنا چاہتی ہے اور مشاعرے میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل ہونے کا ذوق اور شوق دیکر انہیں اردو ادب کے اس درجہ قریب کرنے میں نمایاں ہے۔

اس مشاعرے کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اس میں ظفر زیدی مرحوم کے چھوٹے بھائی سید رضا زیدی نے بھی شرکت کی اور اپنے بھائی کے بارے میں کچھ ذاتی احساسات کا اظہار سامعین کے سامنے کیا۔ انہوں نے سوسائٹی کے اراکین کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ ان کی کوششوں کی بدولت ان کے مرحوم بھائی کا نام ایک زندہ حقیقت بن چکا ہے۔

پروفیسر ضیا (علیگ) کا اعزاز

اردو کے نامور ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر ضیا (علیگ) کو جو ایک طویل عرصہ سے کینیڈا میں مقیم ہیں، کینیڈا کے پاکستانیوں کی فیڈریشن کی طرف سے موصوف کی طویل اور گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں "کینیڈا شیلڈ" کا اعزاز پیش کیا گیا ہے۔

پیارے ضمیر!

تمہارے خط سے تمہاری "چہارسو" کی ایڈیٹری کی خبر ملی۔ یہ کوئی نئی خبر نہیں کچھ نہ کچھ خبر میں تم ہمارے ملک میں بھی رہتے ہو۔ تمہارے روشن ادبی ریکارڈ پر قدرتاً دل خوش ہوتا ہے کہ آخر یہ پودا ہمارا ہی لگایا ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے ہی تمہیں گورنمنٹ کالج اٹک کے میگزین "مشعل" کی ایڈیٹر کے لئے منتخب کیا تھا۔ میں چہار سو میں کیوں نہیں لکھوں گا۔ تمہارے پرچے کے معیار یا مزاج کو دیکھنے کی مجھے ضرورت نہیں بس تھوڑی سی مہلت چاہتا ہوں۔ ان دنوں گرمی نے پریشان کر رکھا ہے۔ ہم فولاد کے کارخانے کی بستی میں رہتے ہیں۔ یعنی گرمی میں اور بھی گرمی۔ تمہارے کیمبل پور کے زمانے کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں . انگریزی
یعنی تیزی میں اور بھی تیزی

کئی مہینے ہوئے میں نے تمہیں ایک طویل خط لکھا تھا تمہارے ایک طویل سوال نامے کے جواب میں۔

یاس کہتی ہے کہ تیرا نامہ برا مارا گیا
آس کہتی ہے میرے خط کا جواب آنے کو ہے

تمہارا خیر اندیش

پروفیسر ایش کمار بہار (بھارت)

برادرم گلزار جاوید صاحب

پیر و مرشد سید ضمیر جعفری کے حکم کے مطابق انتہائی ایمرجنسی میں ڈاکٹر تصدق حسین راجا کا تبصرہ "بر کتاب فن" ارسال خدمت ہے آپ کا فون میں کہیں لکھ بیٹھا ہوں پتا بھی سید ضمیر جعفری نے زبانی بلکہ منہ زبانی لکھوایا ہے۔ اب خدا خیر کرے پچھلا زمانہ ہوتا تو بجاں نوں چٹھی کبوتر کے ذریعے بھجواتا اب ڈاکیے کا کیا اعتبار وہ خط شوق کے جتنے لفافے چاہے لیجائے کبوتر ڈاکخانے میں ملازم ہو سکتا نہیں

والسلام مخلص انعام الحق جاوید

پیر و مرشد

"چہار سو" کے اجرا کی خبر خوش آئند ہے۔ ہم یہاں اس کا انشاء اللہ چرچا کریں گے۔ یہ اور بھی اچھا ہے کہ حمیرا بھی اس کی ادارت میں شامل ہیں۔ گویا آپ نے امریکہ کو اپنی نو آبادی بنالیا۔ یہاں مشاعروں کا موسم بھر آرہا ہے۔ ہم اپنی "مسجد النور" میں نعتیہ مشاعرے کے اہتمام کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ مسجد کی عمارت تو اللہ کے فضل سے مکمل ہو گئی ہے۔ فرحت زاہد یہاں علیل رہتی تھیں۔ سنا ہے بہاولپور میں اب صحت بحال ہو گئی ہے۔ یہ ہوائے وطن اور خاک پاکستان کی تاثیر ہے۔ ورنہ علاج معالجے کی جو سہولتیں یہاں موجود ہیں دنیا بھر میں کہیں نہیں فرحت کو اب آجانا چاہیے۔ ورنہ اگر اس کے پیچھے پیچھے زاہد سعید بھی چلا گیا۔ "جو خامہ اداس نظر آتا ہے" تو نیویارک بلکہ پورا نارتھ افریقہ اور کینیڈا دو تازہ خیال شاعروں سے محروم ہو جائے گا۔

کراچی میں بہن ادا جعفری اور بھائی نور الحسن جعفری اپنے بیٹے عامر کی شادی کے انتظامات میں مصروف ہوں گے۔ ان سے ملاقات ہو یا ٹیلی فون پر بات ہو تو میرا اور رضیہ کا سلام کہیے گا۔ عامر کی بارات تو گویا چلتا پھرتا مشاعرہ ہو گا۔

ڈاکٹر عبد الرحمان عبد (نیویارک)

☆------------☆

عزیزم گلزار جاوید۔ جیتے رہو

اسلام آباد کلب میں عالمی مشاعرے کی رات آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے مسلسل سفر میں ہوں اور چکر یہ کہ آجکل یہی سفر میرا فن ٹھہرا ہے۔ ملتان ڈی جی خان' ساہیوال' ژوب سے تجل خوار ہوتا ہوا ڈیرہ اسمٰعیل خان پہنچا ہوں۔ انشاء اللہ 12 تاریخ شام 5 بجے تک واپسی ہو گی۔

اللہ تعالی آپ کو ارادوں میں استقامت بخشے اور "چہار سو" کی خوشبو چار سو پھیل جائے۔ امید ہے یہ جریدہ گروہی سیاست سے بلند رہ کر اہل قلم کے لئے محبت و اخوت کا پیغام لے کر ابھرے گا اور نئے لکھنے والوں کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔ امید ہے آپ ادب کی پھولن دیوی یا پھول دیو نہیں بنیں گے۔

مسعود احمد چیمہ
کیٹل ایجوکیشن سنٹر ڈیرہ اسمٰعیل خان

☆------------☆